داعیٔ رجوع الی القرآن، بانیٔ تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القُرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

اب دو انداز سے دستیاب ہے

- خوبصورت ٹائٹل
- عمدہ سفید کاغذ
- معیاری طباعت

1 2935 صفحات پر مشتمل، سات جلدوں میں

(الگ الگ جلدیں بھی دستیاب ہیں!)

مکمل سیٹ کی قیمت: 4800 روپے

2 متعدد اضافی خوبیوں کا حامل، طبع جدید

- قرآنی رسم الخط
- تفسیری سائز
- مضبوط ریگزین جلد

2560 صفحات پر مشتمل، چار جلدوں میں

مکمل سیٹ کی قیمت: 4800 روپے

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور

K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

جمادی الاخریٰ ۱۴۴۳ھ

جنوری ۲۰۲۲ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات

تنظیمِ اسلامی

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

قضیۂ فلسطین

تاریخی پس منظر اور ہولناک مستقبل

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖۤ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ: ۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

جلد : 71

شمارہ : 1

جمادی الآخریٰ 1443ھ

جنوری 2022ء

فی شمارہ : 40 روپے

سالانہ زرِ تعاون: 400 روپے

مُدیر
حافظ عاکف سعید

مجلسِ ادارت:
ایوب بیگ مرزا، خورشید انجم

نائب مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

ادارتی معاون:
حافظ محمد زاہد، محمد خلیق

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور 54700، فون: 3-35869501

فیکس: 35834000، ای میل: maktaba@tanzeem.org

ترسیلِ زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

رابطہ برائے ادارتی امور: (042)38939321

publications@tanzeem.org

ویب سائٹ: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: ”دارالاسلام“ ملتان روڈ چوہنگ لاہور

(پوسٹل کوڈ 53800) فون: 78-35473375(042)

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال ــــــــــ 5

اوآئی سی کا افغانستان پر اجلاس — ادارہ

بیانُ القرآن ــــــــــ 9

سورۃ الحشر (آیات ۱ تا ۱۰) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

تذکرہ و تبصرہ ــــــــــ 23

قضیۂ فلسطین: تاریخی پس منظر اور ہولناک مستقبل — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

تذکیر بالقرآن ــــــــــ 43

سورۃ الکہف: ایک اجمالی جائزہ — خورشید انجم

فرائضِ دینی ــــــــــ 53

ڈاکٹر اسرار احمدؒ اور اُن کی دینی خدمت — مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ

علومِ قرآنی ــــــــــ 65

تفسیر کے ناقابلِ اعتبار مآخذ (۲) — پروفیسر حافظ قاسم رضوان

اطلاع برائے قارئین:

قارئین کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ کاغذ کی قیمت اور طباعت کے اخراجات میں ہوش ربا اضافہ کے پیشِ نظر ماہ جنوری سے میثاق کے صفحات 100 کے بجائے 84 کیے جا رہے ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

او آئی سی کا افغانستان پر اجلاس

آغاز میں ہم بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کی ماہنامہ میثاق کے مارچ ۱۹۷۴ء کے شمارے سے ایک تحریر کا کچھ حصّہ نقل کیے دیتے ہیں:

''جمعہ ۲۲ فروری ۱۹۷۴ء کا دن اس اعتبار سے عرصہ دراز تک یاد رہے گا کہ اس دن جملہ مسلمانانِ پاکستان کو بالعموم اور زندہ دلانِ لاہور کو بالخصوص ایک طرف حد درجہ مسرّت وفرحت اور انتہائی نشاط وانبساط کا احساس ہوا تو دوسری طرف اسی قدر شدید رنج وغم اور اتنی ہی سخت افسردگی اور مایوسی کا سامنا کرنا پڑا —— یوں تو انسانی زندگی میں مسرّت وشادمانی اور رنج وغم کچھ لازم وملزوم ہی سے ہیں اور زندگی کا سفر مستقلاً اسی کیفیت میں گزرتا ہے کہ ؎

چند کلیاں نشاط کی چُن کر مدتوں محوِ یاس رہتا ہوں!

تاہم اکثر وبیشتر ہوتا یہ ہے کہ ایک مسرّت بخش واقعہ پیش آیا' خوشی حاصل ہوئی وہ تدریجاً اپنی انتہا کو پہنچی' پھر فطری طور پر اس کے احساس کی شدّت میں کمی ہونی شروع ہوئی اور جب اس کے اثرات بالکل زائل ہو گئے تو یا تو کوئی نیا رنج دہ واقعہ پیش آ گیا یا کوئی پرانا غم جاگ اُٹھا اور کسی نیم مندمل شدہ زخم میں درد کی ٹیسیں اٹھنی شروع ہو گئیں اور اس طرح خوشی وغم اور راحت والم کے دَور آتے رہے اور زندگی اپنی منزلیں طے کرتی گئی۔

جو کچھ ۲۲ فروری کو ہوا یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ اتفاقاً ہو گیا یا ایک طے شدہ پروگرام کے تحت کیا گیا' بہرحال تھا اس کے بالکل برعکس! یعنی یہ کہ خوشی ومسرّت اور راحت وشادمانی کے احساسات تدریجاً ترقی کرتے ہوئے جیسے ہی اپنے نقطہ عروج (climax) کو پہنچے' فوراً ہی غم اپنی پوری شدّت کے ساتھ ظاہر ہو گیا اور دفعتاً رنج والم کا ایک مہیب پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ بعض دوسرے معاملات میں تو فوری تقابل اور اجتماعِ ضدّین (simultaneous contrast) کا تجربہ اس سے پہلے بھی ہوا ہے لیکن خوشی اور غم' مسرّت اور رنج اور راحت والم کا اس قدر شدید اور اتنا فوری وبیک وقت اجتماع کم از کم راقم کی یادداشت کے ذخیرے میں موجود نہیں!

اس کا ایک فائدہ البتہ ہوا' جسے اگر یہ سب کچھ از خود ہوا تو رحمتِ خداوندی سے تعبیر کرنا چاہیے اور اگر یہ جان بوجھ کر کیا گیا تو کسی کے تدبر اور حکمتِ عملی کا شاہکار قرار دیا جانا چاہیے۔ یعنی یہ کہ نتیجۃً مسرّت وغم اور راحت والم کے احساسات کچھ اس طرح مل جل بلکہ گھل مل سے گئے کہ اکثر وبیشتر لوگ کچھ کھوئے کھوئے سے تو رہے لیکن متعین طور پر خود بھی طے نہ کر پائے کہ انہیں خوشی زیادہ ہے یا غم! یا دونوں کے حاصل ضرب میں غلبہ مثبت فرحت ومسرّت کو ہے یا منفی رنج والم کو!

عالمی اسلامی سربراہی کانفرنس کا پاکستان کے دل یعنی ارضِ لاہور میں انعقاد یقیناً ایک حد درجہ نشاط انگیز' وجد آگیں اور کیف آور واقعہ تھا۔ جیسے جیسے اس کے دن قریب آتے گئے اور خصوصاً اہلِ لاہور کی نگاہوں کے سامنے اس کے اہتمام کے مراحل طے ہوتے گئے دلوں کی کلیاں چٹکنی شروع ہو گئیں' احساس کی افسردہ زمیں سے مسرّت کے سوتے پھوٹنے شروع ہو گئے' دکھ درد کا احساس ماند پڑتا گیا اور اِنشراح وانبساط کی ایک کیفیت رفتہ رفتہ قلوب کی دنیا پر طاری ہوتی چلی گئی۔ ملّت کے اجتماعی شعور نے کچھ ایسے محسوس کیا جیسے کم وبیش ایک صدی کے دوران متعدد بار دیکھے گئے خواب کی تعبیر قریب آ رہی ہے۔ چنانچہ اجتماعی یادداشت کے ذخیرے سے کبھی جمال الدین افغانی کا ہیولیٰ اُبھرتا تھا' کبھی تحریکِ خلافت کی یادیں تازہ ہوتی تھیں اور کبھی قافلہ ملّی کے اس آخری حدی خواں کی شخصیت اُبھر کر سامنے آتی تھی جو اسی ارضِ لاہور میں خوابیدہ ہے۔

۲۲ فروری ۱۹۷۴ء کو روئے ارضی کی وسیع ترین مسجد میں کُرۂ ارضی کے کم وبیش تین درجن مسلمان ممالک کے سربراہوں یا نمائندوں کا اجتماع یقیناً اس خوشی اور مسرّت وانبساط کا نقطہ عروج تھا! ہر اُس مسلمان کی فرحت وشادمانی انتہائی بلندیوں کو چھو رہی تھی جس کے دل کی کسی دُور دراز گہرائی میں جذبۂ ملّی کی کوئی چنگاری خواہ امتدادِ زمانہ کی خاکستر اور تلخ حالات و واقعات کی راکھ کی دبیز تہوں میں دبی ہوئی ہی سہی بہرحال کسی درجے میں سلگتی ہوئی موجود تھی۔ خصوصاً اہلِ لاہور کے دل تو بلیوں اُچھل رہے تھے اور ان کا جوش وخروش انتہا کو پہنچا ہوا تھا —— کہ دفعتاً غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

ٹیلی ویژن کے ناظرین نے دیکھا اور ریڈیو کے سامعین نے سنا کہ وزیراعظم بھٹو نے گورنروں' وزرائے اعلیٰ اور ممبران سینٹ واسمبلی کے مشترکہ اجتماع میں ''بنگلہ دیش'' کی تلخ حقیقت کو تسلیم کرنے کا اعلان کر دیا! جوش وخروش ایک دم ختم ہو گیا۔ جذبات سرد پڑ گئے۔ خوشی کی جگہ غم نے لے لی۔ صبحِ اُمید کی بجائے شامِ یاس کا سا منظر چھا گیا۔ فی الجملہ ایک سکتے کا سا عالَم طاری ہو گیا! —— اور یہ کیفیت اس درجہ محیط وہمہ گیر تھی کہ وہ لوگ بھی اس کے تسلّط سے بچ نہ پائے جو خود بنگلہ دیش کی تلخ حقیقت کو تسلیم کرنے کے پُرزور حامی تھے!'' (میثاق' مارچ ۱۹۷۴ء)

اتفاق دیکھئے کہ ۱۶ دسمبر ۲۰۲۱ء گزرے ابھی چند ہی دن ہوئے کہ افغانستان میں درپیش عالمی المیہ کے حوالے سے اسلامی تعاون تنظیم (OIC) کے وزرائے خارجہ کا غیر معمولی اجلاس ۱۹ دسمبر ۲۰۲۱ء کو اسلام آباد میں منعقد ہوا۔ آج بھی اُمّتِ مُسلمہ کو اِسی طرح کے خوشی اور غم کا بیک وقت سامنا ہے۔ ایک طرف تو اُمّتِ مُسلمہ خوشی سے نہال ہے کہ بیس سالہ جِدّوجُہد کے بعد افغان طالبان نے امریکہ کی سرکردگی میں طاغوتی طاقتوں کو افغانستان سے نکال باہر کیا اور افغانستان میں ایک بار پھر امارتِ اسلامیہ کی بنیاد رکھی۔ اِس پر اُمّتِ مُسلمہ کا ہر فرد اللہ تعالیٰ کا جتنا شکر ادا کرے کم ہے۔ البتہ دوسری طرف اُمّتِ مُسلمہ کو شدید شرم ساری کا سامنا ہے کہ ان کے حکمران ایک بار پھر مسلمانوں کو درپیش ایک چیلنج کو حل کرنے کے لیے غیروں اور اسلام دشمن قوتوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے نظر آ رہے

ہیں۔ کاش کہ ۵۷ مسلم ممالک اور اُن کا ''اسلامی تعاون تنظیم'' کے نام سے قائم ادارہ اسلامی اخوت' اتفاق و اتحاد اور خود کفالت کا مظاہرہ کرتا اور غیروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی بجائے خود افغانستان کے موجودہ معاشی بحران کو حل کرنے کی کوشش کرتا۔

بہرحال اسلام آباد میں پاکستان کی میزبانی میں او آئی سی کے رکن ممالک کے وزرائے خارجہ کا غیر معمولی اجلاس اتوار ۱۹ دسمبر ۲۰۲۱ء کو اسلام آباد میں منعقد ہوا جس میں طالبان حکومت کے وزیرِ خارجہ امیر خان متقی اور او آئی سی کے سیکریٹری جنرل سمیت بیس ممالک کے وزرائے خارجہ نے شرکت کی۔ جبکہ دس ممالک کے نائب وزرائے خارجہ یا وزرائے مملکت نے اپنے ملکوں کی نمائندگی کی۔ اس کے علاوہ اس اجلاس میں اقوام متحدہ' یورپی یونین' عالمی مالیاتی اداروں' علاقائی و بین الاقوامی تنظیموں' جاپان' جرمنی اور دیگر نان او آئی سی ممالک کے نمائندوں کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ اس اجلاس کا بنیادی مقصد افغانستان کو موجودہ معاشی بحران کی صورتِ حال سے نکالنے کے لیے طے شدہ حکمت عملی کے تحت اقدامات کے لیے عالمی حمایت اور تعاون حاصل کرنا تھا۔

افغانستان کے معاملے پر او آئی سی کے اس اجلاس کا انعقاد خوش آئند اور حوصلہ افزا بھی ہے جس سے یہ تاثر اُبھرتا ہے کہ عالمِ اسلام نے مل کر افغانستان کو معاشی بحران سے نکالنے کی ایک مشترکہ کوشش کا آغاز کر دیا ہے۔ جیسا کہ اجلاس کے مشترکہ اعلامیہ میں پُرامن' مستحکم' متحد اور خودمختار افغانستان کے لیے افغان عوام سے اظہارِ یکجہتی کا اظہار کیا گیا' اقوامِ متحدہ کے اداروں اور او آئی سی کے تعاون سے افغانستان میں امدادی سرگرمیاں جاری رکھنے پر زور دیا گیا' عالمی برادری سے افغانستان کے شہریوں اور افغان پناہ گزینوں کو پناہ دینے والے ممالک کی فوری امداد کا مطالبہ کیا گیا۔ شرکاء نے عالمی برادری' اقوام متحدہ' سکیورٹی کونسل سے متفقہ مطالبہ کیا کہ افغانستان کی موجودہ حکومت پر لگائی گئی عالمی پابندیاں انسانی امداد کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننی چاہئیں۔ علاوہ ازیں طارق علی بخیت کو اسلامی تعاون تنظیم کے سیکریٹری جنرل کا افغانستان کے حوالے سے خصوصی ایلچی مقرر کیا گیا۔

عالمی برادری سے یہ بھی مطالبہ کیا گیا کہ وہ افغانستان سے مسلسل رابطہ رکھے تاکہ افغان عوام کے لیے انسانی ہمدردی کی بنیاد پر امداد کو یقینی بنایا جا سکے۔ اجلاس کے شرکاء نے اتفاق کیا کہ او آئی سی افغان عوام کو امداد فراہم کرنے کے عمل میں کلیدی کردار ادا کرے گی۔ شرکاء کی جانب سے او آئی سی کے جنرل سیکریٹریٹ کو کابل میں مالی اور لاجسٹک اقدامات اٹھانے کی ہدایت کی گئی۔ ازبکستان میں اقوام متحدہ کے لاجسٹک مرکز تعمیر کرنے کے اقدام کا خیر مقدم کیا گیا۔ اجلاس میں منجمد اثاثوں کی بحالی کے اقدامات کی اہمیت پر بھی زور دیا گیا۔ اجلاس میں اتفاق کیا گیا کہ رکن ممالک' اسلامی مالیاتی ادارے' عطیہ دہندگان اور دیگر بین الاقوامی شراکت دار افغانستان کے لیے ہیومینٹیرین ٹرسٹ فنڈ کے ساتھ ساتھ افغانستان کو انسانی امداد فراہم کرنے کے وعدوں کا اعلان کریں۔ فیصلہ کیا گیا کہ او آئی سی جنرل سیکریٹریٹ' عالمی ادارۂ صحت اور دیگر متعلقہ اسٹیک ہولڈرز کے ساتھ ویکسین کے ساتھ ساتھ دیگر طبّی

سامان' تکنیکی اور متعلقہ امداد کی افغانستان کے لوگوں تک فراہمی میں مدد کرے گا۔ اجلاس میں افغانستان فوڈ سکیورٹی پروگرام شروع کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور اسلامک آرگنائزیشن فار فوڈ سکیورٹی (IOFS) سے درخواست کی گئی کہ جب ضروری ہو' تنظیم کے غذائی تحفظ کے ذخائر کی صلاحیت کو استعمال کرتے ہوئے اس سلسلے میں ضروری اقدامات کیے جائیں۔ کہا گیا کہ او آئی سی کے رکن ممالک' بین الاقوامی عطیہ دہندگان' اقوام متحدہ کے فنڈز اور پروگرامز اور دیگر بین الاقوامی اداروں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں کہ وہ افغانستان فوڈ سیکورٹی کو یقینی بنائیں۔ اجلاس میں او آئی سی کے سیکریٹری جنرل سے افغان عوام اور پڑوسی ممالک میں افغان پناہ گزینوں کو ضروری انسانی اور اقتصادی امداد فراہم کرنے کے لیے ڈونر مالیاتی اداروں کے ساتھ مل کر کام کرنے کے مطالبے کا اعادہ کیا گیا۔ اسی طرح اجلاس میں افغانستان سے تمام دہشت گرد تنظیموں بالخصوص القاعدہ' داعش اور اس سے وابستہ تنظیموں کے خلاف ٹھوس اقدامات کرنے کا مطالبہ بھی کیا گیا۔

اب دل تھام لیجیے کہ میری باری آئی! اجلاس کے شرکاء نے فیصلہ کیا کہ افغان عوام کو سخت مشکلات کا سامنا ہے اور ان مسائل کو حل کرنے کے لیے قانونی بینکنگ سیکٹر تک آسان رسائی پر توجہ دی جائے گی۔ افغانستان کے لیے ایک انسانی ٹرسٹ فنڈ قائم کیا جائے گا جو اسلامی ترقیاتی بینک کے ماتحت ہوگا۔ یعنی افغان عوام کو جو بھی امداد ملے گی وہ طالبان حکومت کے نظام کے ذریعے نہیں بلکہ براہِ راست بینکنگ نظام کے تحت ملے گی۔ اس کا واضح مطلب یہی ہے کہ شریعت کے بالمقابل عالمی معاشی نظام قائم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اس بات کی تصدیق اجلاس کے اس اعلامیہ سے بھی ہوتی ہے کہ اقوام متحدہ' او آئی سی جنرل سیکریٹریٹ' اسلامی ترقیاتی بینک اور انسانی ٹرسٹ فنڈ کے تعاون سے معاشی وسائل اور انسانی امداد کی فراہمی کو یقینی بنائے گا اور اس حوالے سے حکمتِ عملی وضع کرے گا۔ یعنی امداد کے نام پر جو بھی کھیل کھیلا جائے گا اس کی باگ ڈور نہ تو افغان طالبان کے ہاتھ میں اور نہ ہی او آئی سی کے ہاتھ میں ہوگی' بلکہ براہِ راست عالمی اداروں کے تحت سب کچھ ہوگا۔ اسی ضمن میں او آئی سی کے رکن ممالک نے بین الاقوامی برادری بشمول اقوام متحدہ' بین الاقوامی تناظیم اور بین الاقوامی مالیاتی اداروں سے اپیل کی کہ وہ افغانستان کے لیے ہر ممکن اور ضروری بحالی' تعمیرِ نو' ترقی' مالی' تعلیمی' تکنیکی اور مادی امداد ''پالیسی ٹولز'' کے طور پر فراہم کریں۔ بات بالکل واضح ہے کہ جو بھی امداد ملے گی وہ پالیسی ٹولز کے طور پر ہوگی۔ اسی طرح اجلاس میں طے کیا گیا کہ ممتاز مذہبی اسکالرز اور علماء کے ایک وفد کا اہتمام کیا جائے گا جس کی قیادت انٹرنیشنل اسلامک فقہ اکیڈمی اور دیگر متعلقہ مذہبی ادارے کریں گے۔ یہ وفد افغان طالبان کے ساتھ اہم مسائل پر بات چیت کرے گا' جیسے کہ رواداری سمیت اسلام میں اعتدال' تعلیم تک مساوی رسائی اور خواتین کے حقوق وغیرہ۔ یعنی یہ وفد اسلام کا ایک ایسا سوفٹ (اور روشن خیال) امیج افغان طالبان کے سامنے متعارف کروائے گا جو استعماری قوتوں کے لیے قابلِ قبول ہو۔ (باقی صفحہ 82 پر)

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃُ الحَشر

آیات ۱ تا ۵

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ ۚ وَ ہُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ① ہُوَ الَّذِیۡۤ اَخۡرَجَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ مِنۡ دِیَارِہِمۡ لِاَوَّلِ الۡحَشۡرِ ؕ مَا ظَنَنۡتُمۡ اَنۡ یَّخۡرُجُوۡا وَ ظَنُّوۡۤا اَنَّہُمۡ مَّانِعَتُہُمۡ حُصُوۡنُہُمۡ مِّنَ اللّٰہِ فَاَتٰىہُمُ اللّٰہُ مِنۡ حَیۡثُ لَمۡ یَحۡتَسِبُوۡا ۟ وَ قَذَفَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمُ الرُّعۡبَ یُخۡرِبُوۡنَ بُیُوۡتَہُمۡ بِاَیۡدِیۡہِمۡ وَ اَیۡدِی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ۟ فَاعۡتَبِرُوۡا یٰۤاُولِی الۡاَبۡصَارِ ② وَ لَوۡ لَاۤ اَنۡ کَتَبَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمُ الۡجَلَآءَ لَعَذَّبَہُمۡ فِی الدُّنۡیَا ؕ وَ لَہُمۡ فِی الۡاٰخِرَۃِ عَذَابُ النَّارِ ③ ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ شَآقُّوا اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ ۚ وَ مَنۡ یُّشَآقِّ اللّٰہَ فَاِنَّ اللّٰہَ شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ ④ مَا قَطَعۡتُمۡ مِّنۡ لِّیۡنَۃٍ اَوۡ تَرَکۡتُمُوۡہَا قَآئِمَۃً عَلٰۤی اُصُوۡلِہَا فَبِاِذۡنِ اللّٰہِ وَ لِیُخۡزِیَ الۡفٰسِقِیۡنَ ⑤

آیت ① ﴿سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ ۚ﴾ ’’تسبیح کرتی ہے اللہ کی ہر وہ شے جو آسمان میں ہے اور ہر وہ شے جو زمین میں ہے۔‘‘

’’المُسَبِّحات‘‘ کے سلسلے کی پہلی سورۃ یعنی سورۃ الحدید کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے: ﴿سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۚ﴾۔ یہاں ’’مَا فِی‘‘ کا اضافہ ہے‘ جس سے گویا

مفہوم میں مزید زور (emphasis) پیدا ہو گیا ہے۔ باقی ساری آیت کے الفاظ وہی ہیں۔

﴿وَہُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ①﴾ ’’اور وہ زبردست ہے‘ کمال حکمت والا۔‘‘

اُس کے اختیارات مطلق ہیں‘ لیکن وہ اپنے اختیارات کا استعمال بہت حکمت سے کرتا ہے۔

آیت ② ﴿ہُوَ الَّذِیۡۤ اَخۡرَجَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ مِنۡ دِیَارِہِمۡ لِاَوَّلِ الۡحَشۡرِ ؕ﴾ ’’وہی ہے جس نے نکال باہر کیا اُن کافروں کو جو اہلِ کتاب میں سے تھے اُن کے گھروں سے‘ پہلے جمع ہونے کے وقت۔‘‘

یہ یہودی قبیلہ بنونضیر کی مدینہ منورہ سے جلاوطنی کے واقعہ کا ذکر ہے۔ اس واقعہ کا پس منظر یوں ہے کہ حضور ﷺ کی ہجرت کے وقت مدینہ (یثرب) میں تین یہودی قبائل بنوقینقاع‘ بنونضیر اور بنوقریظہ آباد تھے۔ حضور ﷺ نے مدینہ تشریف لانے کے فوراً بعد ان قبائل کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جو تاریخ میں ’’میثاقِ مدینہ‘‘ کے نام سے مشہور ہے۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بنیادی طور پر یہ مدینہ کے ’’مشترکہ دفاع‘‘ کا معاہدہ تھا۔ ان میں سے قبیلہ بنوقینقاع نے تو معاہدے کے کچھ ہی دیر بعد مسلمانوں کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ چنانچہ معاہدے کی مسلسل خلاف ورزیوں کی بنا پر حضور ﷺ نے غزوۂ بدر کے بعد اس قبیلہ کو مدینہ بدر کر دیا۔ غزوۂ اُحد (۳ ہجری) کے بعد قبیلہ بنونضیر نے بھی مسلمانوں کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ غزوۂ اُحد میں مسلمانوں کی وقتی شکست سے ان کی کمزوری کا تاثر لے کر جہاں عرب کے بہت سے دوسرے قبائل نے سر اٹھانا شروع کیا‘ وہاں یہ قبیلہ بھی اپنے عہد کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مسلمانوں کے خلاف مہم جوئی میں شامل ہو گیا۔ ان کے سردار کعب بن اشرف نے قریشِ مکّہ سے گٹھ جوڑ کر کے انہیں مدینہ پر حملہ کرنے کی باقاعدہ دعوت دی اور انہیں یقین دلایا کہ تم لوگ باہر سے حملہ کرو‘ ہم اندر سے تمہاری مدد کریں گے۔ اسی دوران کعب بن اشرف نے حضور ﷺ کو (نعوذ باللہ) شہید کرنے کی ایک سازش بھی تیار کی۔ اس کے لیے ان لوگوں نے حضور ﷺ کو کسی اہم بات چیت کے بہانے اپنے ہاں بلایا۔ منصوبہ یہ تھا کہ کسی دیوار کے بالکل ساتھ آپؐ کی نشست کا انتظام کیا جائے اور جب آپؐ وہاں بیٹھے ہوں تو دیوار کے اوپر سے چکّی کا بھاری پاٹ آپؐ پر گرا دیا جائے۔ آپؐ ان کے بلانے پر ان کے محلے میں تشریف لے گئے مگر اللہ تعالیٰ نے جب وحی کے ذریعے آپؐ کو ان کی اس گھناؤنی سازش سے آگاہ کیا تو آپؐ واپس تشریف لے آئے۔

بنونضیر کی ان ریشہ دوانیوں اور مسلسل بدعہدی کی وجہ سے بالآخر ربیع الاوّل ۴ ہجری میں حضور ﷺ نے ان کے خلاف لشکر کشی کا حکم دے دیا۔ البتہ جب مسلمانوں نے ان کی گڑھیوں کا محاصرہ کیا تو انہوں نے چند دن محصور رہنے کے بعد لڑے بغیر ہتھیار ڈال دیے۔ اس پر حضور ﷺ نے ان کی جان بخشی کرتے ہوئے انہیں مدینہ سے نکل جانے کا حکم دیا' بلکہ آپ ﷺ نے مزید نرمی فرماتے ہوئے انہیں یہ اجازت بھی دے دی کہ جاتے ہوئے وہ جس قدر سامان اونٹوں پر لاد کر لے جا سکتے ہیں' لے جائیں۔ غزوۂ احزاب (۵ ہجری) کے بعد بنوقریظہ کو بھی ان کی عہد شکنی اور سازشوں کی وجہ سے کیفر کردار تک پہنچا دیا گیا۔ اس طرح یہودِ مدینہ کے تینوں قبائل میثاقِ مدینہ کی خلاف ورزی کے باعث ایک ایک کر کے اپنے انجام کو پہنچ گئے۔

آیت میں لِاَوَّلِ الْحَشْرِ کا ایک مفہوم تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ مسلمانوں نے پہلی مرتبہ ہی جب ان پر لشکر کشی کی تو انہوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ اس کے علاوہ اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ مدینہ سے جلاوطنی تو ان لوگوں کا پہلا حشر ہے' پھر ایک وقت آئے گا جب انہیں خیبر سے بھی نکال دیا جائے گا اور اس کے بعد انہیں جزیرہ نمائے عرب کو بھی خیر باد کہنا پڑے گا (چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں تمام عیسائیوں اور یہودیوں کو جزیرہ نمائے عرب سے نکال دیا گیا) اور پھر ایک حشر وہ ہوگا جو قیامت کے دن برپا ہوگا۔

﴿مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا﴾ ''(اے مسلمانو!) تمہیں یہ گمان نہیں تھا کہ وہ (اتنی آسانی سے) نکل جائیں گے''

﴿وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ﴾ ''اور وہ بھی سمجھتے تھے کہ ان کے قلعے انہیں اللہ (کی پکڑ) سے بچا لیں گے''

﴿فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا ۗ﴾ ''تو اللہ نے ان پر حملہ کیا وہاں سے جہاں سے انہیں گمان بھی نہ تھا۔''

﴿وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ﴾ ''اور ان کے دلوں میں اُس نے رعب ڈال دیا''

اللہ تعالیٰ اپنے دشمنوں کو جس طریقے سے چاہے ہزیمت سے دوچار کر دے۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے انہیں اس قدر مرعوب کر دیا کہ وہ اپنے مضبوط قلعوں کے اندر بھی خود کو غیر محفوظ سمجھنے لگے اور اپنے تمام تر وسائل کے باوجود بھی مسلمانوں سے مقابلہ کرنے کی ہمت نہ کر سکے۔

﴿يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ وَاَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ ۗ﴾ ''وہ برباد کر رہے تھے اپنے گھروں کو' خود اپنے ہاتھوں سے بھی اور اہلِ ایمان کے ہاتھوں سے بھی۔''

چونکہ انہیں یہ اجازت مل چکی تھی کہ اپنے سامان میں سے جو کچھ وہ اپنے ساتھ اونٹوں پر لاد کر لے جا سکتے ہیں لے جائیں اس لیے وہ اپنے گھروں کی دیواروں اور چھتوں میں سے دروازے' کھڑکیاں' کڑیاں' شہتیر وغیرہ نکالنے کے لیے خود ہی انہیں مسمار کر رہے تھے۔ ان کی اس تخریب میں مسلمانوں نے بھی ان کا ہاتھ بٹایا ہوگا۔

﴿فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ ۝۲﴾ ''پس عبرت حاصل کرو اے آنکھیں رکھنے والو!''

یہ گویا پیچھے رہ جانے والے قبیلے بنی قریظہ کو سنایا جا رہا ہے کہ تم اپنے بھائی بندوں کے اس انجام سے عبرت حاصل کرو اور سازشوں سے باز آ جاؤ!

آیت ۳ ﴿وَلَوْلَآ اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَآءَ﴾ ''اور اگر اللہ نے پہلے سے نہ لکھ دیا ہوتا ان پر جلاوطن ہونا''

﴿لَعَذَّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا ۭ وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ ۝۳﴾ ''تو انہیں سخت عذاب دیتا دنیوی زندگی میں' اور آخرت میں ان کے لیے آگ کا عذاب ہے۔''

آیت ۴ ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَاۗقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ﴾ ''یہ اس لیے کہ انہوں نے اللہ اور اُس کے رسول (ﷺ) کی مخالفت کی۔''

﴿وَمَنْ يُّشَاۗقِّ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۴﴾ ''اور جو اللہ کی مخالفت پر کمر کس لے تو (سمجھ لو کہ) اللہ سزا دینے میں بہت سخت ہے۔''

آیت ۵ ﴿مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَاۗىِٕمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ ''تم نے کھجور کے جو درخت کاٹے یا جن کو چھوڑ دیا ان کی جڑوں پر کھڑے' تو یہ اللہ کے اِذن سے ہوا''

لِینہ ایک خاص قسم کی کھجور کے درخت کو کہتے ہیں۔ یہودیوں کی گڑھیوں اور حویلیوں کے گرد یہ درخت باڑ کی شکل میں کثرت سے موجود تھے۔ مسلمانوں نے جب ان کا محاصرہ کیا تو حملہ

کے لیے راستے بنانے کی غرض سے حسبِ ضرورت ان میں سے کچھ درختوں کو انہوں نے کاٹ ڈالا۔ یہودیوں نے مسلمانوں کے اس عمل کو ہدفِ تنقید بنایا اور پروپیگنڈا کیا کہ یہ لوگ خود کو مؤمنین کہتے ہیں اور ان کے قائد اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں‘ لیکن ان لوگوں کی اخلاقیات کا معیار یہ ہے کہ پھل دار درختوں کو بھی کاٹنے سے دریغ نہیں کرتے۔ یہودیوں کے اس پراپیگنڈے کا جواب اللہ تعالیٰ نے خود دیا۔ چنانچہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے مذکورہ اقدام پر اپنی منظوری (sanction) کی مہر ثبت کرتے ہوئے واضح کر دیا کہ مسلمانوں نے یہ درخت جنگی ضرورت کے تحت اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی موجودگی میں کاٹے ہیں۔ چنانچہ جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں ایسا کرنے سے منع نہیں کیا تو پھر سمجھ لو کہ اللہ کی طرف سے اس کی اجازت دی گئی تھی۔

﴿وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ ۝۵﴾ ’’اور تاکہ وہ فاسقوں کو ذلیل و رسوا کرے۔‘‘

اب اگلی آیات میں مالِ فے کا ذکر آ رہا ہے جو اس سورت کا اہم ترین مضمون ہے۔ چنانچہ ان آیات کے مطالعہ سے پہلے یہ سمجھ لیجیے کہ مالِ فے کیا ہے اور یہ مالِ غنیمت سے کس طرح مختلف ہے۔ مالِ غنیمت تو وہ مال ہے جو باقاعدہ جنگ کے نتیجے میں حاصل ہو۔ اس سے پہلے سورۃ الانفال کی آیت ۴۱ میں مالِ غنیمت کی تقسیم کے بارے میں حکم آ چکا ہے۔ اس حکم کے مطابق مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ اللہ‘ اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم‘ رسولؐ کے قرابت داروں‘ یتیموں‘ مسکینوں اور مسافروں کے لیے مخصوص ہوگا‘ جبکہ باقی چار حصے اس جنگ میں حصہ لینے والے مجاہدین کے مابین تقسیم کر دیے جائیں گے‘ اور اس تقسیم میں سوار کو پیدل کے مقابلے میں دو حصے ملیں گے۔ اس کے برعکس ’’مالِ فے‘‘ وہ مال ہے جو مسلمانوں کو کسی جنگ کے بغیر ہی حاصل ہو جائے‘ جیسے زیر مطالعہ واقعہ میں باقاعدہ جنگ کی نوبت نہیں آئی تھی‘ مسلمانوں نے بنونضیر کا محاصرہ کیا اور انہوں نے مرعوب ہو کر ہتھیار ڈال دیے۔ چنانچہ اس مہم کے نتیجے میں حاصل ہونے والی زمینیں اور دوسری تمام اشیاء مالِ فے قرار پائیں۔ آگے آیت ۷ میں مالِ فے کے بارے میں واضح کر دیا گیا کہ یہ مال کُل کا کُل اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہے۔ اس میں سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی مرضی سے غرباء و مساکین کو تو دیں گے لیکن عام مسلمانوں کو اس میں سے حصہ نہیں ملے گا۔

آیات ۶ تا ۱۰

وَ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۶ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَ لِذِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ؕ وَ مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۗ وَ مَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۷ لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ اَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا وَّ يَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝۸ۚ وَ الَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَ الْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَ لَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَ لَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۬ؕ وَ مَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۹ۚ وَ الَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَ لِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَ لَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۰ۧ

آیت ۶ ﴿وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ﴾ ’’اور جو مال کہ ہاتھ لگا دیا ہے اللہ نے اپنے رسولؐ کے ان (بنونضیر) سے‘‘

﴿فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ﴾ ’’تو (اے مسلمانو!) تم نے اس پر نہیں دوڑائے گھوڑے اور نہ اونٹ‘‘

﴿وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ﴾ ’’لیکن مسلّط کر دیتا ہے اللہ

اپنے رسولوںؑ کو جس پر چاہتا ہے۔‘‘

﴿وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۶﴾ ’’اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔‘‘

یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی مشیت اور قدرت سے بنونضیر کے حوصلے پست کر دیے اور انہوں نے تم لوگوں کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ اس مہم میں ان کے خلاف تمہیں جنگ تو لڑنا ہی نہیں پڑی۔ لہٰذا تم پر واضح ہونا چاہیے کہ بنونضیر کی جلاوطنی کے نتیجے میں جو مال تمہارے ہاتھ لگا ہے وہ مالِ غنیمت نہیں ہے۔ اب اگلی آیت میں اس مال کے مصارف کے بارے میں حکم دیا جا رہا ہے۔

آیت ۷ ﴿مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى﴾ ’’جو مال بھی ہاتھ لگا دے اللہ اپنے رسولؐ کے بستیوں والوں سے‘‘

﴿فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ﴾ ’’تو وہ ہے اللہ کے لیے‘ رسولؐ کے لیے‘ قرابت داروں‘ یتیموں‘ مسکینوں اور مسافروں کے لیے‘‘

واضح رہے کہ اللہ اور رسولؐ سے مراد یہاں اسلامی ریاست ہے۔ پھر چونکہ رسول اللہ ﷺ کا اپنا ذاتی ذریعہ معاش تو کوئی تھا نہیں‘ اس لیے یہ مال آپؐ کے ذاتی اخراجات مثلاً ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے نان نفقہ اور دوسری معاشرتی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے بھی تھا۔ اس کے علاوہ اس میں حضور ﷺ کے قرابت داروں کی مدد بھی رکھی گئی تاکہ آپؐ اپنے قرابت داروں کے ساتھ حُسنِ سلوک کے تقاضے پورے کر سکیں۔ اسی طرح اس مال میں ان تمام اقسام کے ناداروں اور محتاجوں کا بھی حق رکھا گیا جن کا ذکر اس آیت میں آیا ہے۔

﴿كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً ۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ۭ﴾ ’’تاکہ وہ تم میں سے مال داروں ہی کے درمیان گردش میں نہ رہے۔‘‘

اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ معاشرے میں دولت کی تقسیم منصفانہ ہو اور اس کی گردش کے ثمرات معاشرے کے تمام طبقات تک پہنچیں۔ یہ اسلامی معیشت کا بہت اہم اور بنیادی اصول ہے۔ اسی اصول کے تحت اللہ تعالیٰ نے مالِ فے زیادہ تر ناداروں اور محتاجوں کی محرومیوں کے ازالے کے لیے مختص فرما دیا۔ مالِ فے بھی اگر مالِ غنیمت کی طرح تقسیم کیا جاتا تو یہاں بھی سواروں کو دوہرا حصہ ملتا اور ظاہر ہے جس شخص کے پاس گھوڑا یا اونٹ ہے وہ تو پہلے ہی سے کچھ خوشحال ہے۔ تو

اس تقسیم سے مالِ فے کا بھی زیادہ تر حصہ خوشحال لوگوں کو ہی ملتا۔

واضح رہے کہ اسلام کے نظامِ عدل وقسط میں تمام انسانوں کو معاشی طور پر برابر کر دینے کا تصوّر نہیں پایا جاتا۔ ایسا ہونا عملی طور پر ممکن بھی نہیں۔ ظاہر ہے ایک سپاہی اور سپہ سالار کسی طرح بھی برابر نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ کمیونزم اپنے تمام تر دعووں اور انقلابی نعروں کے باوجود ایسی ’’معاشی مساوات‘‘ کی کوئی ہلکی سی جھلک بھی دنیا کو نہیں دکھا سکا۔ اس کے برعکس اسلام کا نظامِ معیشت معاشرے سے معاشی ناہمواریوں کو ختم کرنے اور امیر وغریب کے درمیان فرق وتفاوت کو کم سے کم کرنے پر زور دیتا ہے۔ اس کے لیے اسلام ہر وہ دروازہ بند کر دینے کا حکم دیتا ہے جس کی وجہ سے چند ہاتھوں میں ارتکازِ دولت کا خدشہ ہو اور ہر وہ راستہ کھولنے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے جس سے گردشِ دولت کا رُخ اُمراء سے غرباء کی طرف پھرنے اور معاشی محرومیوں کے ازالے کا امکان ہو۔ آج معاشی پیچیدگیوں کی وجہ سے جدید معاشرے میں جو گمبھیر صورتحال جنم لے رہی ہے اس کا ادراک سب سے پہلے جس عالم دین کو ہوا وہ شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ تھے۔ شاہ ولی اللہؒ ایسی صورت حال کے بارے میں فرماتے ہیں کہ جس ملک یا معاشرے میں تقسیمِ دولت کا نظام غیر منصفانہ ہوگا وہاں کچھ لوگ دولت کے انبار جمع کر کے مسرفانہ عیاشیوں اور بدمعاشیوں میں مبتلا ہو جائیں گے‘ جبکہ محروم طبقے کے لوگ بار برداری کے جانور بن کر رہ جائیں گے۔ ایسی ہی صورتِ حال کے بارے میں حضور ﷺ کا فرمان ہے: ((كَادَ الْفَقْرُ اَنْ يَّكُوْنَ كُفْرًا))[1] کہ محرومی اور احتیاج انسان کو کفر تک پہنچا دیتی ہے۔ گویا تقسیمِ دولت کا غیر منصفانہ نظام ایسی دودھاری تلوار ہے جس کی دوطرفہ کاٹ سے مذکورہ دونوں طبقوں کے افراد مذہبی وانسانی اقدار سے بیگانہ و بے نیاز ہو کر عملی طور پر معاشرے کے لیے ناسور بن جاتے ہیں۔ اُمراء کو تو اپنے اللّوں تللّوں سے ہی فرصت نہیں ملتی جبکہ غریب و نادار عوام دنیا و مافیہا سے بے خبر صبح سے شام تک کمر توڑ مشقّت میں مصروف رہتے ہیں۔ اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شیطان اپنے ایجنڈے کی تکمیل کے لیے آگے بڑھتا ہے اور محروم طبقے کے افراد کے دلوں میں ظالم استحصالی طبقے کے خلاف بغض وعداوت کی آگ سلگانا شروع کر دیتا ہے: ﴿اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ

۱۔ المقاصد الحسنة للسخاوی‘ ح:۳۶۸۔ اللآلی المنثورہ للزرکشی (بدر الدین)‘ ح:۲۰۹ [له شاهد]

﴿يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ﴾ (المائدۃ:۹۱) ''شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ تمہارے درمیان دشمنی اور بغض پیدا کر دے''۔ تصوّر کریں اگر ایک سیٹھ صاحب کی بیٹی کی شادی کے موقع پر کروڑوں روپے کا اسراف صرف بے جا نمود و نمائش کی مد میں ہو رہا ہو گا تو یہ سب کچھ دیکھ کر اس کے اس غریب ملازم کے دل میں نفرت و عداوت کے کیسے کیسے جذبات پیدا ہوں گے جس کی بیٹی گھر میں بیٹھی صرف اس لیے بوڑھی ہو رہی ہے کہ وہ اس کے ہاتھ پیلے کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ پھر ہمارے معاشرے میں جب ایک کروڑ پتی کی بیٹی لاکھوں کا جہیز لے کر دوسرے کروڑ پتی کی بہو بن جاتی ہے تو دولت مال داروں ہی کے مابین گردش میں رہتی ہے۔

﴿وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۗ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ﴾ ''اور جو کچھ رسولؐ تم لوگوں کو دے دیں وہ لے لو اور جس چیز سے روک دیں اس سے رک جاؤ۔''

ان الفاظ میں گویا اہلِ ایمان کو ترغیب دی جا رہی ہے کہ وہ مالِ فے سے متعلق نئے قانون کے تحت رسول اللہ ﷺ کے فیصلوں کو بخوشی قبول کریں۔ ظاہر ہے لشکرِ اسلام میں شامل لوگ تو بنونضیر کے علاقے سے حاصل ہونے والے مال و اسباب کو مالِ غنیمت سمجھتے ہوئے اس میں سے حصّے کی توقع کر رہے تھے۔ اب جب مذکورہ حکم کے تحت اس مال کو مالِ فے قرار دے کر اس کی تقسیم کا نیا قانون بنا دیا گیا تو لشکر کے شرکاء کو طبع بشری کے تحت ایک دھچکا تو ضرور لگا ہو گا۔ چنانچہ اس حکم کے تحت بنونضیر کے محاصرے میں شامل اہلِ ایمان کو بالخصوص اور تمام اہلِ ایمان کو بالعموم دین کا بنیادی اصول بتا دیا گیا کہ تمہارے لیے اللہ کے رسول ﷺ کا ہر فیصلہ آخری حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ معاملہ چاہے کوئی بھی ہو اللہ کے رسول ﷺ تم لوگوں کو جو دے دیں وہ لے لیا کرو اور جس چیز سے آپؐ منع کر دیں اس سے منع ہو جایا کرو۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝﴾ ''اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ سزا دینے میں بہت سخت ہے۔''

اب اگلی آیات میں مالِ فے کی تقسیم کے بارے میں مزید وضاحت کی جا رہی ہے کہ جب یہ مال مذکورہ قانون کے تحت بیت المال میں آ جائے گا تو اس کی تقسیم میں بنیادی طور پر ضرورت مندوں کی ضروریات کو ترجیح دی جائے گی۔ ظاہر ہے اللہ کے رسول ﷺ تو اس میں سے اپنے اور اپنے گھر والوں کے لیے وہی کچھ قبول کریں گے جو آپؐ کی انتہائی بنیادی ضروریات

کے لیے ناگزیر ہو گا۔ آپ ﷺ نے تو اپنی ذات اور ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن پر شروع دن سے ہی فقر طاری کر رکھا تھا۔ سورۃ الاحزاب کے چوتھے رکوع میں واقعہ ایلاء کے بارے میں ہم پڑھ آئے ہیں کہ ازواجِ مطہراتؓ کی طرف سے نان نفقہ بڑھانے کے مطالبے پر حضور ﷺ نے انؓ سے علیحدگی اختیار فرمائی تھی۔ چنانچہ مالِ فے کا بڑا حصّہ کس کے لیے مختص کیا جائے گا:

آیت ۸ ﴿لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ﴾ ''یہ (خاص طور پر) اُن تنگ دست مہاجرین کے لیے ہے جو نکال دیے گئے اپنے گھروں اور اپنے اموال سے''

﴿يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ﴾ ''وہ اللہ کے فضل اور اُس کی رضا کے متلاشی ہیں اور اللہ اور اُس کے رسولؐ کی مدد کر رہے ہیں۔''

﴿اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝﴾ ''یہی لوگ ہیں جو سچّے ہیں۔''

یہاں سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ کے یہ الفاظ بھی ذہن میں تازہ کر لیں: ﴿وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ﴾ یعنی حق و باطل کی کشمکش سے دراصل اللہ تعالیٰ یہ دیکھنا چاہتا ہے (ظاہر کر دینا چاہتا ہے) کہ کون لوگ غیب میں ہونے کے باوجود اُس کی اور اُس کے رسولوں کی مدد کے لیے جاں بکف کھڑے ہوتے ہیں۔ آیت زیر مطالعہ میں نہ صرف مالِ فے کی تقسیم کے حوالے سے فقراء مہاجرین کی ترجیح واضح کر دی گئی بلکہ ان کی بے لوث قربانیوں کی تصدیق و توثیق بھی فرما دی گئی کہ یہ لوگ صرف اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی خاطر اپنا سب کچھ چھوڑ کر گھروں سے نکلے ہیں۔ اب چونکہ ان کے پاس اپنی بنیادی ضروریات کے لیے بھی کچھ نہیں تو مالِ فے کی تقسیم میں ان کے لیے خصوصی حصّہ رکھا جائے گا۔

آیت ۹ ﴿وَالَّذِيْنَ تَبَوَّءُو الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ ''اور (اس مال میں اُن کا بھی حق ہے) جو آباد تھے اپنے گھروں میں اور جن کے پاس ایمان بھی تھا ان (مہاجرین کی آمد) سے پہلے''

یہ انصارِ مدینہ کا ذکر ہے کہ مہاجرین کی آمد پر ان کا طرزِ عمل کیا تھا:

﴿يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ﴾ ''وہ محبّت کرتے ہیں ان سے جنہوں نے ہجرت کی ان کی طرف''

مدینہ منورہ کے مسلمانوں نے مکّہ مکرمہ سے آنے والے مہاجرین کو کھلے دل سے خوش آمدید کہا۔ ان میں سے کسی کے دل میں قطعاً کوئی ایسا خیال نہیں آیا کہ ان لوگوں کے آنے سے ہماری آبادی بڑھ جائے گی اور ان کی ناداری و محرومی ہماری معیشت پر بوجھ بن جائے گی۔

﴿وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا﴾ ''اور وہ نہیں پاتے اپنے سینوں میں کوئی حاجت اس بارے میں کہ جو کچھ ان (مہاجرین) کو دیا جاتا ہے''

انصارِ مدینہ کے دل اپنے مہاجر بھائیوں کے لیے ایثار و قربانی کے اعلیٰ جذبات سے لبریز ہیں' اور یہ جذبات ان کے دلوں میں اس دولتِ ایمان کے باعث پیدا ہوئے ہیں جس سے اللہ تعالیٰ نے انہیں بہرہ ور فرمایا ہے۔ یہ آیت دراصل انصارِ مدینہ کی تسکین و تشفی کے لیے ان کے جذبۂ ایمان کو اپیل کرتے ہوئے نازل ہوئی تاکہ اگر ان میں سے کچھ لوگوں کے دلوں میں بنونضیر کے چھوڑے ہوئے مال سے متوقع حصّہ نہ ملنے کے باعث کچھ ملال وغیرہ کے احساسات پیدا ہوئے ہوں تو وہ ختم ہو جائیں۔

﴿وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۭ﴾ ''اور وہ تو خود پر ترجیح دیتے ہیں دوسروں کو خواہ ان کے اپنے اوپر تنگی ہو۔''

ایثار کے معنی کسی کے لیے قربانی دینے اور دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دینے کے ہیں۔ ظاہر ہے انصارِ مدینہ میں سے بھی سب لوگ دولت مند تو نہیں تھے' ان میں بھی بہت سے لوگ نادار اور تنگ دست تھے' لیکن ان میں سے ہر ایک نے اپنی احتیاج اور ضرورت کو پسِ پشت ڈال کر استطاعت بھر اپنے مہاجر بھائیوں کی مدد کی تھی۔ ان کے اسی جذبۂ ایثار کا اعتراف یہاں اس آیت میں کیا گیا ہے۔

﴿وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝﴾ ''اور جو کوئی بھی بچا لیا گیا اپنے جی کے لالچ سے تو وہی لوگ ہیں فلاح پانے والے۔''

اب اس کے بعد جو آیت آ رہی ہے وہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایران' عراق' مصر' شام وغیرہ کے مفتوحہ علاقوں کی زمینوں کے بارے میں فیصلہ کرتے ہوئے اس آیت سے استدلال کیا تھا۔ ان علاقوں کی زمینیں بہت زرخیز ہیں' خصوصی طور پر عراق اور شام کے درمیان صحرا میں واقع وہ علاقہ جو Fertile Crescent کہلاتا ہے' اپنی زرخیزی کے

اعتبار سے پوری دنیا میں مشہور ہے۔ جب یہ وسیع و عریض علاقے فتح ہوئے تو ان کی زرعی زمینوں کے نظم و نسق کا مسئلہ سامنے آیا۔ اس معاملے میں زیادہ تر صحابہؓ کی رائے یہ تھی کہ مالِ غنیمت کی تقسیم کے اصول کے مطابق پانچواں حصّہ بیت المال کے لیے مختص کر کے باقی زمینیں ہر محاذ کے مجاہدین میں تقسیم کر دی جائیں۔ البتہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس رائے سے متفق نہیں تھے۔ آپ کی رائے یہ تھی کہ ان ممالک کی زمینیں مالِ غنیمت کے بجائے مالِ فے کے زمرے میں آتی ہیں' اس لیے ان پر مالِ فے کے قانون کا اطلاق ہونا چاہیے۔ اس نکتے کی مزید وضاحت یہ ہے کہ مالِ غنیمت صرف وہ مال ہے جو جنگ میں دشمن کو شکست دینے کے بعد عین محاذِ جنگ سے مسلمان مجاہدین کے ہاتھ لگے۔ جیسے اسلحہ' راشن' بھیڑ بکریاں' اونٹ گھوڑے' جنگی قیدی وغیرہ۔ لیکن اگر کسی ایک جنگ کے نتیجے میں کوئی پورا ملک فتح ہو جائے (جیسے ابراہیم لودھی پانی پت کے میدان میں بابر سے صرف ایک جنگ ہارا تو اس کے نتیجے میں پورے ہندوستان پر بابر کا قبضہ ہو گیا) تو میدانِ جنگ سے باہر کی اراضی' املاک اور آبادی کو مالِ فے شمار کیا جائے گا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس معاملے میں اگلی آیت کے ان الفاظ سے استدلال کیا تھا: ﴿وَالَّذِيْنَ جَاۗءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ﴾ ''اور وہ لوگ جو ان کے بعد آئیں گے''۔ پچھلی آیات کے مضمون سے اس آیت کے ان الفاظ کا ربط یوں بنتا ہے کہ مالِ فے پر حق ہے اللہ و رسولؐ کا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عزیز و اقارب کا' غرباء و مساکین کا' انصار و مہاجرین کا (بحوالہ آیات ۷ اور ۸) اور اُن لوگوں کا جو اُن کے بعد آئیں گے۔ ان آیات کے سیاق و سباق میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا موقف یہ تھا کہ آج کے مالِ فے میں اس اُمّت کے قیامت تک آنے والے مسلمانوں کا بھی حق ہے اور اگر آج یہ زمینیں چند ہزار مجاہدین میں تقسیم کر دی گئیں تو بعد میں آنے والے مسلمان گویا اس حق سے محروم رہ جائیں گے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس استدلال سے بعض معتبر صحابہؓ نے اختلاف بھی کیا اور مذکورہ زمینوں کو مالِ غنیمت کے قانون کے تحت متعلقہ مجاہدین میں تقسیم کرنے پر اصرار کیا۔ اس اختلافِ رائے کے بعد حضرت عمرؓ نے اس معاملے میں غور و خوض کے لیے اوس' خزرج اور مہاجرین میں سے چند صحابہؓ پر مشتمل ایک کمیشن تشکیل دے دیا۔ کمیشن کے ارکان نے مسئلے سے متعلق مختلف آراء اور دیگر پہلوؤں کو مدِّنظر رکھتے ہوئے متفقہ طور پر جو فیصلہ دیا وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کے عین

مطابق تھا اور بعد میں اسی فیصلے پر تمام صحابہؓ کا اجماع ہوا۔ صحابہؓ کے اس اجماع یا فیصلے کے مطابق تمام مسلم ممالک کی اراضی دو اقسام میں بٹ گئی۔ جن علاقوں کے لوگ لڑے بھڑے بغیر ایمان لے آئے ان کی زمینیں ''عُشری زمینیں'' (ایسی زمین جو انفرادی ملکیت میں ہو اور اس کی پیداوار سے باقاعدہ عُشر وصول کیا جاتا ہو) قرار پائیں۔ جبکہ بزورِ شمشیر فتح ہونے والے ممالک کی زمینوں کو ''خراجی زمینوں'' (ایسی زمینیں جو بیت المال کی ملکیت ہوں اور ان کو کاشت کرنے والے لوگ اسلامی حکومت کو خراج ادا کریں) کا درجہ دیا گیا۔ مثلاً مدینہ کو حضور ﷺ نے کسی جنگ کے نتیجے میں فتح نہیں کیا تھا بلکہ مدینہ کے لوگوں نے حضور ﷺ کو وہاں آنے کی خود دعوت دی تھی' اس لیے اوس اور خزرج کی تمام زمینیں ''عُشری'' قرار پائیں اور متعلقہ لوگوں کی انفرادی ملکیت میں ہی رہیں' جبکہ ایران' عراق' مصر' شام وغیرہ ممالک کی زمینیں خراجی زمینوں کی حیثیت سے اسلامی حکومت کی تحویل میں چلی گئیں۔ اس طرح حضرت عمرؓ کے اجتہاد کے نتیجے میں انسانی تاریخ میں پہلی مرتبہ زمین کی اجتماعی ملکیت (collective ownership of land) کا نظام متعارف ہوا۔ اس وقت مفتوحہ علاقوں کی زمینیں اگر مالِ غنیمت کی حیثیت سے چند ہزار مجاہدین میں تقسیم کر دی جاتیں تو اسلامی حکومت کے تحت انسانی تاریخ کی سب سے بڑی جاگیرداری وجود میں آ جاتی۔ اور پھر یہ سلسلہ یہیں پر ختم نہ ہوتا بلکہ جس ملک کی اراضی و املاک پر مالِ غنیمت کے قانون کا اطلاق ہوتا اس ملک کی پوری آبادی کو جنگی قیدیوں کی حیثیت سے غلام اور لونڈیاں بنا کر تقسیم کرنے کا مطالبہ بھی آتا۔

اسی قانون کے تحت پچھلی صدی تک ہندوستان کی زمینوں کے بارے میں بھی یہاں کے علماء کا اجماع تھا کہ یہاں کی تمام زمینیں خراجی ہیں اور اس حیثیت سے یہ زمینیں یہاں کے مسلمانوں کی اجتماعی ملکیت ہیں اور یہ کہ ہندوستان میں کوئی عشری زمین نہیں ہے۔ اس کا ذکر ہندوستان کے عظیم مفسّر و محدّث قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے فقہ کے مسائل سے متعلق اپنے رسالے ''مَالَا بُدَّ مِنْہ'' میں بھی کیا ہے۔ قاضی صاحب موصوف بہت بڑے صوفی اور مفتی بھی تھے۔ ان کی لکھی ہوئی ''تفسیر مظہری'' جسے انہوں نے اپنے مرشد مرزا مظہر جانِ جاناںؒ کے نام سے منسوب کیا ہے' آج کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ قاضی صاحب کا مرتّب کردہ مذکورہ رسالہ فقہ کے بنیادی اور ابتدائی مسائل پر مشتمل ہے اور برصغیر کے تمام عربی مدارس میں پڑھایا جاتا ہے۔

اس رسالے میں انہوں نے عُشر سے متعلق مسائل شامل ہی نہیں کیے اور اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ جب ہندوستان میں کوئی عُشری زمین ہے ہی نہیں اور عُشر سے متعلق احکام کی تنفیذ و تعمیل کا کوئی امکان ہی نہیں تو ان مسائل کو لکھنے' پڑھنے یا سمجھنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس علاقے میں جب کبھی اسلامی حکومت قائم ہو تو نئے بندوبست اراضی کے تحت بڑے بڑے جاگیرداروں سے وہ زمینیں واپس لی جا سکتی ہیں جو ماضی کے بادشاہوں' انگریز حکمرانوں اور سپہ سالاروں کی ''نظرِ کرم'' کے باعث انہیں عطا ہوئی تھیں۔

آیت ۱۰ ﴿وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ﴾ ''اور وہ لوگ جو ان کے بعد آئے (مالِ فے پر ان کا بھی حق ہے) وہ کہتے ہیں: اے ہمارے ربّ! تُو بخش دے ہمیں بھی اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی جو ایمان میں ہم سے سبقت لے گئے''

﴿وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۰﴾ ''اور ہمارے دلوں میں اہلِ ایمان کے لیے کوئی کدورت نہ پیدا ہونے دے' اے ہمارے ربّ' بے شک تُو نہایت شفیق اور رحم فرمانے والا ہے۔''

اس آیت میں واضح کر دیا گیا ہے کہ مالِ فے کی تقسیم میں حاضر و موجود لوگوں کے علاوہ بعد میں آنے والے مسلمانوں اور ان کی آئندہ نسلوں کا حصّہ بھی ہے۔ مزید برآں اس میں ایک اہم اخلاقی درس بھی دیا گیا ہے کہ کسی مسلمان کے دل میں کسی دوسرے مسلمان کے لیے کوئی بغض' کینہ یا کدورت نہیں ہونی چاہیے' اور مسلمانوں کے لیے صحیح طرزِ عمل یہی ہے کہ وہ اپنے اسلاف کے حق میں دعائے مغفرت کرتے رہیں' نہ یہ کہ انہیں سبّ و شتم کا نشانہ بنائیں۔

یہاں پر پہلا رکوع اختتام پذیر ہوا۔ اس رکوع میں بنونضیر کے مدینہ سے انخلاء اور ان کی چھوڑی ہوئی املاک (مالِ فے) سے متعلق احکام کا ذکر تھا۔ اب اگلی آیات میں منافقین کا تذکرہ ہے کہ ان لوگوں نے غزوۂ بنونضیر کے حوالے سے کیا کردار ادا کیا۔ ❁❁❁

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت و تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

قضیۂ فلسطین

تاریخی پس منظر اور ہولناک مستقبل

بانیٔ تنظیمِ اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ

۱۶/اپریل ۲۰۰۴ء کا خطابِ جمعہ

نحمدہٗ ونصلی علٰی رَسولہِ الکریم ... امّا بَعد:

اعوذ باللہ من الشَّیطٰن الرَّجیم ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ ①﴾ (بنی اسراءیل)

﴿وَ اِذۡ قَالَ مُوۡسٰی لِقَوۡمِہٖ یٰقَوۡمِ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَۃَ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ اِذۡ جَعَلَ فِیۡکُمۡ اَنۡۢبِیَآءَ وَ جَعَلَکُمۡ مُّلُوۡکًا ٭ۖ وَّ اٰتٰىکُمۡ مَّا لَمۡ یُؤۡتِ اَحَدًا مِّنَ الۡعٰلَمِیۡنَ ⑳ یٰقَوۡمِ ادۡخُلُوا الۡاَرۡضَ الۡمُقَدَّسَۃَ الَّتِیۡ کَتَبَ اللّٰہُ لَکُمۡ وَ لَا تَرۡتَدُّوۡا عَلٰۤی اَدۡبَارِکُمۡ فَتَنۡقَلِبُوۡا خٰسِرِیۡنَ ㉑ الٰی قولہٖ تعالیٰ : قَالُوۡا یٰمُوۡسٰۤی اِنَّا لَنۡ نَّدۡخُلَہَاۤ اَبَدًا مَّا دَامُوۡا فِیۡہَا فَاذۡہَبۡ اَنۡتَ وَ رَبُّکَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا ہٰہُنَا قٰعِدُوۡنَ ㉔ قَالَ رَبِّ اِنِّیۡ لَاۤ اَمۡلِکُ اِلَّا نَفۡسِیۡ وَ اَخِیۡ فَافۡرُقۡ بَیۡنَنَا وَ بَیۡنَ الۡقَوۡمِ الۡفٰسِقِیۡنَ ㉕ قَالَ فَاِنَّہَا مُحَرَّمَۃٌ عَلَیۡہِمۡ اَرۡبَعِیۡنَ سَنَۃً ۚ یَتِیۡہُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ ؕ فَلَا تَاۡسَ عَلَی الۡقَوۡمِ الۡفٰسِقِیۡنَ ㉖﴾ (المائدۃ) صدق اللہ العظیم

آج کا موضوع میرے لیے نیا نہیں ہے۔ اس پر مَیں تقریباً پچیس سال سے گفتگو کر رہا ہوں۔ سب سے پہلے مَیں نے ۱۹۸۰ء میں کینیڈا اور امریکہ کے مابین واقع 'نیاگرا'

کے مقام پر اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن آف نارتھ امریکہ کے اجلاس میں اسی موضوع پر تقریر کی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ایران میں تازہ انقلاب آیا تھا اور اس کا ایک بڑا غلغلہ اور زورشور تھا۔ ''News week'' اور ''Times'' جیسے کثیر الاشاعت ہفت روزہ جرائد نے اس پر خاص نمبر شائع کیے تھے۔ نیوز ویک کا ٹائٹل تھا: "The Militant Islam: on the March" یعنی اب عسکری اسلام آگے بڑھنا شروع ہو گیا ہے۔ گویا کہ دنیا کانپ رہی تھی کہ دنیا کے ایک ملک میں اتنا زبردست انقلاب آ گیا۔ دوسری طرف افغانستان میں روسیوں کے خلاف جہاد زوروں پر تھا' جس میں افغان اپنی سرفروشی' بہادری اور جاں فشانی کے تاریخ میں نئے باب رقم کر رہے تھے۔ دنیائے اسلام میں عام طور پر یہ خیال تھا کہ اب بس غلبۂ اسلام کا دَور شروع ہو رہا ہے۔

مَیں نے اُس وقت عرض کیا تھا کہ مسلمانوں کا یہ موجودہ اُبھار اور اُبال ہانڈی کے اُبال کی طرح بہت عارضی ہے۔ ابھی اُمّتِ مُسلمہ پر بڑے سخت دَور آنے والے ہیں اور اسے بڑی بڑی سزائیں ملنے والی ہیں۔ البتہ اس کے بعد پھر یقیناً ایک دَور آنے والا ہے کہ پوری دُنیا پر اسلام کا غلبہ ہو گا۔ اس کے بعد مَیں نے ۱۹۹۲ء میں مضامین لکھے جو ''نوائے وقت'' میں چھپتے رہے' جو بعد ازاں ۱۹۹۳ء میں ''سابقہ اور موجودہ مسلمان اُمتوں کا ماضی' حال اور مستقبل'' کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہوئے۔ سابقہ اُمّتِ مُسلمہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم یعنی بنی اسرائیل تھی جسے اللہ تعالیٰ نے کتابِ ہدایت اور میزانِ شریعت دی۔ وہ قوم دو ہزار برس تک اس منصب پر فائز رہی کہ وہ دنیا میں اللہ کی نمائندہ تھی۔ انہیں ۱۴۰۰ قبل مسیح میں (یعنی آج سے تقریباً ساڑھے تین ہزار سال قبل) تورات عطا کی گئی۔ اُس وقت وہ اُمّتِ مُسلمہ تھے۔ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی ولادتِ مبارکہ ۵۷۱ء میں ہوئی اور آپؐ پر وحی کا آغاز ۶۱۰ء میں ہوا۔ آپ ﷺ کی بعثت کے چودہ سال بعد ۶۲۴ء میں تحویلِ قبلہ کا حکم آیا کہ ﴿فَوَلِّ وَجۡہَکَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ؕ﴾ (البقرۃ: ۱۴۴) یعنی اب نماز میں رُخ بیت المقدس کی بجائے خانہ کعبہ کی طرف کرلو! یہ حکم اس بات کی واضح علامت تھا کہ سابقہ اُمّتِ مُسلمہ جس کا مرکز

یروشلم (بیت المقدس) تھا' وہ اپنی اس حیثیت سے معزول کر دی گئی ہے' اور جو نئی اُمّت اس منصب پر فائز کی گئی ہے وہ اُمّتِ محمد ﷺ ہے' جس کا مرکز خانہ کعبہ ہے۔ اس حوالے سے حضور ﷺ کی بعثت تک بنی اسرائیل کی دو ہزار سالہ تاریخ تھی' جبکہ حضور ﷺ کی بعثت کے بعد سے تقریباً ساڑھے چودہ سو برس اس اُمّتِ محمد ﷺ کے گزر چکے ہیں۔

ارضِ فلسطین: تاریخ کے آئینے میں

فلسطین کے بارے میں مَیں نے ایک بڑا پیارا جملہ ''نیوز ویک'' میں پڑھا تھا: "Too small a geography but too big a history"۔ فلسطین جغرافیہ کے اعتبار سے بہت چھوٹی جگہ ہے۔ جب تک مغربی کنارے پر یہودیوں کا قبضہ نہیں ہوا تھا اُس وقت تک اسرائیلی ریاست ایک خنجر کی مانند تھی جو عالَمِ عرب کے سینے میں پیوست ہے۔ اس کا رقبہ ہماری سابقہ ریاست بہاول پور کے برابر ہے لیکن اس کی تاریخ پانچ ہزار سال تک پہنچی ہوئی ہے۔ اس کے مانند دنیا کے کسی علاقے کی تاریخ محفوظ نہیں ہے۔ اس کی تاریخ کا آغاز انبیاء کرام علیہم السلام کے سلسلے سے ہوتا ہے۔ ۲۰۰۰ قبل مسیح میں حضرت ابراہیم علیہ السلام ہجرت کر کے فلسطین آئے' جو اِمامُ الناس اور خلیل اللہ ہیں۔ آپؑ عراق کے جنوبی حصے اُر میں پیدا ہوئے تھے جو خلیج فارس کے بہت قریب واقع تھا۔ یہ سلطنت کلدانیہ کا صدر مقام تھا' جہاں کے بادشاہوں کو نمرود کہتے تھے۔ آپ علیہ السلام کی تمام زندگی امتحانات اور آزمائشوں میں گزری۔ آگ میں بھی ڈال دیے گئے۔ اس کے کافی عرصے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ علیہ السلام کا بہت بڑا امتحان لیا گیا جب جوان بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کرنے کا حکم ہوا۔ لیکن دشمنوں کی طرف سے آپؑ کی زندگی کا سب سے بڑا امتحان یہ تھا کہ آپ کو آگ میں ڈال دیا گیا۔ اللہ نے آگ کو حکم دیا تو وہ گل وگلزار بن گئی۔

اس کے بعد آپ علیہ السلام نے وہاں سے ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا قانون رہا ہے کہ جب کسی قوم کی طرف کوئی رسول بھیجا جائے اور وہ قوم اس کی جان لینے

پر آمادہ ہو جائے تو پھر اسے ہجرت کی اجازت ہو جاتی ہے۔ حضور ﷺ کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا تھا۔ جب قریش کے سرداروں نے دارالندوہ میں بیٹھ کر آپ ﷺ کے قتل کا فیصلہ کر لیا تب ہجرت کی اجازت آ گئی۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام عراق سے ہجرت کر کے فلسطین چلے گئے۔ عراق اور فلسطین کے درمیان چونکہ بہت بڑا ناقابلِ عبور صحرا ہے (جو اَب صحرائے اردن کہلاتا ہے) لہٰذا آپؑ پہلے جنوبی عراق سے چل کر شمالی عراق گئے اور پھر وہاں سے مغرب کو ہو کر فلسطین میں اترے۔ یہاں انہوں نے اپنا مسکن اور مرکز بنا لیا۔ اگرچہ بڑے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو آپ نے حجاز میں بیت اللہ کے قریب آباد کیا لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنا قیام یہیں فلسطین میں رہا۔ پھر اُن کے بیٹے حضرت اسحاق اور پوتے حضرت یعقوب (علیہما السلام) کا مقام بھی یہیں رہا۔ ان تین انبیاء کے وہاں تسلسل کے ساتھ قیام کو بھی بنی اسرائیل اپنی تاریخ کا حصہ سمجھتے ہیں۔ ''اسرائیل'' حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب تھا اور ''بنی اسرائیل'' کا اطلاق آپؑ کے بارہ بیٹوں اور ان کی آئندہ نسلوں پر ہوتا ہے۔ عبرانی میں اسرائیل کا مطلب ہے عبداللہ (اللہ کا بندہ)۔ بہرحال اُس وقت تک بنی اسرائیل کا ایک قوم کی حیثیت سے کوئی تصور موجود نہیں تھا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں بنی اسرائیل مصر چلے گئے اور چار پانچ سو سال وہاں رہے۔ اس دوران ان کا فلسطین کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رہا۔ لہٰذا بنی اسرائیل کی تاریخ کے ساتھ اُن صدیوں کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے وقت بنی اسرائیل شدید ترین غلامی اور تعذیب کی زندگی گزار رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے سے فرعون کی غلامی سے نجات دی۔ پانچ چھ سو سال قبل ستّر افراد کا قافلہ جو حضرت یوسف علیہ السلام کی دعوت پر مصر میں داخل ہوا تھا' اب اس کی تعداد بوڑھے' بچے' جوان' عورتیں' مرد سب ملا کر چھ لاکھ تک پہنچ چکی تھی۔ ۱۴۰۰ قبل مسیح میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہِ سینا پر بلا کر تورات دی گئی۔ اس کے بعد بنی اسرائیل کو فرعون سے نجات ملی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے چھ لاکھ کے قافلے کو لے کر مصر سے چلے اور فلسطین کی سرحد پر پہنچ گئے۔ وہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو حکم دیا کہ اب جنگ

کے لیے تیّار ہو جاؤ اور اس ارضِ مقدّس میں داخل ہو جاؤ۔

سورۃ المائدۃ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اپنی قوم سے مکالمہ بایں الفاظ نقل ہوا ہے:

﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ﴾ ’’یاد کرو جبکہ کہا تھا موسیٰ نے اپنی قوم سے‘‘ ﴿یٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ﴾ ’’اے میری قوم کے لوگو! اللہ کے انعام و اِکرام کو یاد کرو جو تم پر ہوا ہے‘‘ ﴿اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ﴾ ’’جبکہ اُس نے تمہارے اندر انبیاء پیدا کیے‘‘۔ حضرت یوسف اور حضرت موسیٰ علیہما السلام اللہ کے نبی ہیں جو اسرائیل کی نسل سے ہیں۔ ﴿وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا﴾ ’’اور تمہارے اندر بادشاہ بھی بنائے۔‘‘ یہ دراصل پیشین گوئی ہے کہ تمہارے اندر طالوت‘ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہم السلام جیسے بڑے بڑے بادشاہ آئیں گے۔ ﴿وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝۲۰﴾ ’’اور تمہیں اللہ نے وہ سب کچھ دیا جو پوری دنیا میں کسی اور قوم کو نہیں دیا۔‘‘ ﴿يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ ’’اے میری قوم کے لوگو! سب داخل ہو جاؤ اس ارضِ مقدّس میں جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دی ہے۔‘‘ اللہ کی طرف سے اُس کا رسول یہ کہہ رہا ہے کہ یہ تمہارے لیے اللہ کی طرف سے مقدّر ہے۔ ﴿وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ۝۲۱﴾ ’’(اب دیکھو بزدلی کا مظاہرہ نہ کرنا!) اور اپنی پیٹھوں پر نہ لوٹ جانا مبادا کہ تم خسارے والے ہو جاؤ۔‘‘

لیکن پوری قوم نے اپنے رسولؑ کو کورا جواب دے دیا۔ ﴿قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا﴾ ’’انہوں نے کہا: اے موسیٰ! ہم ہرگز ہرگز کبھی بھی اس (ارضِ فلسطین) میں داخل نہیں ہوں گے جب تک کہ (جو لوگ اس پر قابض ہیں) وہاں موجود ہیں۔‘‘ یعنی اگر وہ وہاں سے نکل جائیں گے تو ہم داخل ہو جائیں گے‘ جنگ کرنے کو ہم تیار نہیں ہیں۔ ﴿فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ۝۲۴﴾ ’’تو جاؤ تم اور تمہارا ربّ جا کر لڑو‘ ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔‘‘ ﴿قَالَ رَبِّ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِيْ وَاَخِيْ﴾ ’’(اس پر حضرت موسیٰؑ نے اللہ سے) عرض کیا: اے میرے ربّ! (پوری قوم نے جواب دے دیا ہے) مجھے اختیار ہے تو اپنی جان پر اور اپنے بھائی (ہارون)

کی جان پر۔‘‘ ﴿فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ۝۲۵﴾ ’’پس تُو ہمارے اور ان فاسقوں کے درمیان علیحدگی کر دے۔‘‘ ہم ان کے ساتھ نہیں رہنا چاہتے۔ اللہ تعالیٰ نے علیحدگی تو نہیں ہونے دی البتہ یہ فرما دیا کہ یہ بزدلی نہ دکھاتے تو ہم ابھی ان کو فلسطین دے دیتے۔ ﴿قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ﴾ ’’فرمایا (انہوں نے بزدلی دکھائی ہے) تو یہ (ارضِ مقدّس) چالیس برس تک اُن پر حرام کر دی گئی ہے‘‘ ﴿يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ۝۲۶﴾ ’’اب وہ اسی زمین کے اندر بھٹکتے پھریں گے۔ پس اب تم افسوس نہ کرو اِن فاسقوں کے بارے میں (کہ ان کا یہ حشر ہو رہا ہے)۔‘‘

بنی اسرائیل پر یہ چالیس برس ایسے گزرے کہ اس دوران حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کا انتقال ہو گیا۔ ساری نسل جو کہ مصر میں غلام رہی تھی‘ ختم ہو چکی تھی۔ اب نئی نوجوان نسل اُبھری جو صحرا میں پیدا ہوئی اور یہیں پلی بڑھی۔ صحرا کی زندگی چونکہ بڑی سخت ہوتی ہے لہٰذا اس سختی کو جھیلنے والی نسل میں عزم و ہمت اور جوش و ولولہ تھا۔ اس نسل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جانشین حضرت یوشع بن نون کی سرکردگی میں فلسطین پر حملہ کیا اور اریحہ نامی شہر (جو اَب جریکو کہلاتا ہے) فتح کر لیا۔ اسی طرح رفتہ رفتہ پورا فلسطین فتح ہو گیا۔ لیکن فاتح قوم نے ایک بہت بڑی غلطی یہ کی کہ پورے فلسطین پر کوئی ایک حکومت قائم نہیں کی‘ بلکہ بارہ میں سے دس قبیلوں نے اپنی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کر لیں جبکہ دو قبیلوں کا پتا ہی نہیں چلتا کہ کہاں گئے۔ انہیں "The lost tribes of the house of Israel" کہا جاتا ہے۔ ان کا تاریخ میں کہیں سراغ نہیں ملتا۔

میری ذاتی رائے یہ ہے کہ وہ بھارت میں آ کر آباد ہو گئے اور یہاں کا برہمن وہی یہودی طبقہ ہے جو اُس وقت یہاں آیا اور اپنے آپ کو ’’برہما‘‘ یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام سے منسوب کیا۔ ’’صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى‘‘ کا قرآن مجید میں دو جگہ ذکر ہے‘ لیکن وہ آج ہمارے پاس کہیں نہیں ہیں۔ تورات بگڑی تگڑی ہے لیکن ہے تو سہی‘ زبور محرّف ہے لیکن ہے تو سہی‘ انجیل کیسی بھی ہو وجود تو رکھتی ہے‘ لیکن آج دنیا میں صُحفِ ابراہیم کے نام

سے کوئی کتاب موجود نہیں ہے۔ میری رائے ہے کہ ہندوؤں کے اپنشد درحقیقت صُحفِ ابراہیم کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ مَیں نے یہ رائے اپنشد کا کچھ مطالعہ کر کے قائم کی ہے۔ واللہ اعلم!

بہرحال انہوں نے دس چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کرلیں جو باہم دست وگریبان رہنے لگیں' یہاں تک کہ انہوں نے وہ طرزِعمل اختیار کیا جو ہندوستان میں انگریز کی آمد کے وقت بعض مسلم ریاستوں نے اختیار کیا تھا۔ جب انگریز جنوبی ہند پر حملہ آور ہوا تو میسور کے سلطان حیدر علی نے زبردست مزاحمت کی' پھر سلطان ٹیپو اُن کے خلاف ڈٹا رہا۔ اُس وقت چھوٹی چھوٹی مسلم ریاستیں آپس میں لڑ رہی تھیں اور ٹیپو کے خلاف انگریز کی مدد کر رہی تھیں۔ اسی طرح بنی اسرائیل کی ان ریاستوں کا یہ حشر ہوا کہ آس پاس کی مشرک قومیں ایک دوسرے کے خلاف لڑائی میں ان سے مدد لیتی تھیں۔ ہوتے ہوتے اُن قوموں کا اتنا اثر ونفوذ ہوگیا کہ وہ تقریباً پورے فلسطین پر قابض ہوگئے اور بنی اسرائیل کو اُن کے گھروں سے نکال باہر کیا۔ یہ ان کی تین سو برس کی تاریخ ہے۔ پھر انہیں ہوش آیا کہ ہمیں تو جہاد کرنا چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے وقت کے نبی سے کہا کہ ہمارے لیے ایک سپہ سالار معین کر دیں کہ جس کی سربراہی میں ہم اللہ کے راستے میں جنگ کریں۔ انہوں نے اللہ کے حکم سے حضرت طالوت کو سپہ سالار مقرر کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت طالوت کو جالوت کے مقابلے میں فتح دی۔ اس جنگ میں حضرت داؤد علیہ السلام نے جو اُس وقت ایک نوجوان چرواہے تھے' اپنے گوپیے سے غرقِ آہن جالوت کی آنکھ پر ایسا پتھر مارا کہ وہ ہلاک ہوگیا۔

اس فتح سے یہود کی تاریخ کا ایک زرّیں باب شروع ہوا' جیسے ہمارے خلفاءِ ثلاثہ کا دَور تاریخِ اسلام کا زرّیں باب ہے۔ حضرات ابوبکر وعمر وعثمان رضی اللہ عنہم کا دور اسلام کی اصل عظمت کا دور ہے۔ اسی طرح وہاں بھی تین حکمرانوں کا دور میرے نزدیک ان کی خلافتِ راشدہ ہے جو ۱۰۰۰ ق م سے ۹۰۰ ق م تک تقریباً ۱۰۰ برس پر محیط ہے۔ اس میں پہلے بادشاہ حضرت طالوت تھے' پھر اُن کے داماد حضرت داؤد اور پھر حضرت داؤد کے بیٹے

حضرت سلیمان (علیہما السلام) بادشاہ ہوئے۔ اس کے بعد اُن کا دورِ زوال شروع ہوگیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد یہ سلطنت اُن کے دو بیٹوں کے درمیان تقسیم ہوگئی۔ شمالی حصّہ 'اسرائیل' اور جنوبی حصّہ 'یہودیہ' کہلایا۔ شمالی سلطنت کا دارالخلافت 'سامریہ' اور جنوبی کا 'یروشلم' تھا۔ دونوں سلطنتوں کی باہمی آویزش کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۷۰۰ قبل مسیح میں آشوریوں نے اسرائیل کی شمالی سلطنت ختم کر دی' صرف چھوٹی سی جنوبی سلطنت یہودیہ باقی رہ گئی' جس میں یروشلم بھی موجود تھا۔ پھر اُن کے ہاں فسق وفجور کا بازار گرم ہوا تو اللہ تعالیٰ نے عراق کے بادشاہ اور اُس وقت کے نمرود بخت نصر (Nebuchadnezzar) کے ہاتھوں ان پر زبردست عذاب مسلّط کیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جو معبد (ہیکلِ سلیمانی) تعمیر کیا تھا (جو اصل مسجد اقصیٰ تھی)' بخت نصر نے اسے اس طرح مسمار کیا کہ کوئی ایک اینٹ بھی سلامت نہیں رہنے دی۔ لاکھوں افراد کو یروشلم میں موقع پر قتل کر دیا گیا' جبکہ چھ لاکھ یہودی مَردوں' عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا کر بابل لے جایا گیا جو اَب سلطنتِ عراق کا صدر مقام بن چکا تھا۔ ڈیڑھ سو برس تک فلسطین یہودیوں سے خالی رہا۔ اس دور کو وہ اپنا دَورِ اسارت (Era of Captivity) کہتے ہیں۔ اس کے بعد ایران کا بادشاہ سائرس منظرِ عام پر آیا' جس نے عراق پر حملہ کیا اور نمرود کو شکست دے کر یہودیوں کو واپس فلسطین جانے کی اجازت دے دی۔

فلسطین واپسی کے بعد بنی اسرائیل میں حضرت عزیر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ایک زبردست تجدیدی واصلاحی دعوت اُٹھی کہ توبہ کرو' اپنی حرام خوریوں اور حرام کاریوں سے باز آجاؤ! تم نے جو مشرکانہ اوہام اختیار کر لیے ہیں ان کو ترک کر دو اور جن مشرک عورتوں سے تم نے شادیاں کر رکھی ہیں ان کو چھوڑ دو۔ اس اصلاحی تحریک کے ذریعے بنی اسرائیل کی تطہیر (Purgation) کی گئی اور انہیں مشرکانہ اعمال سے پاک کیا گیا۔ اس کے بعد انہوں نے معبد سلیمانی کو دوبارہ تعمیر کیا۔ اس کو تاریخی اصطلاح میں ''معبدِ ثانی'' (Second Temple) کہتے ہیں۔

اس کے بعد اُن پر یونانی حملہ آور ہوئے۔ سکندرِ اعظم یہیں سے گزر کر تباہی و

بربادی مچاتا ہوا پنجاب تک آیا۔ پھر اس کے سپہ سالار سلیوکس کی اُن پر حکومت رہی۔ کچھ عرصے بعد رومیوں نے یہاں پر حکومت قائم کر لی' البتہ انہوں نے براہِ راست قبضہ نہیں کیا بلکہ وہاں پر مقامی بادشاہتیں رہنے دیں۔ اس کے بعد فلسطین میں ایک عظیم مکابی سلطنت قائم ہوئی جو ۱۷۰ ق م سے ۶۳ ق م تک پورے سو سال قائم رہی اور اس نے بالکل وہی نقشہ دکھا دیا جو حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے زمانے کا تھا۔ اس دوران پورے فلسطین پر یہودیوں کا قبضہ رہا۔ پھر اُن کے اندر زوال آیا اور اللہ تعالیٰ نے رومیوں کو اُن پر مسلط کیا۔ حضرت مسیح علیہ السلام اسی زمانے میں مبعوث کیے گئے۔ یہودیوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کا کفر کیا۔ انہیں ۳۳ یا ۳۴ء میں اللہ تعالیٰ نے آسمان پر اٹھا لیا۔

۷۰ عیسوی میں یہودیوں کی پیٹھ پر اللہ تعالیٰ کے عذاب کا دوسرا کوڑا برسا جب ایک رومن جنرل ٹائٹس نے ان پر حملہ کیا اور یروشلم کی دوبارہ اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ Second Temple گرا دیا گیا۔ چنانچہ ۷۰ء سے آج ۲۰۰۴ء تک ۱۹۳۴ برس سے یہودیوں کا ''خانہ کعبہ'' گرا ہوا ہے۔ ٹائٹس نے یروشلم میں ایک دن میں ایک لاکھ ۳۳ ہزار یہودی قتل کیے اور ۶۶ ہزار کو وہ قیدی بنا کر یورپ لے گیا۔ قیدیوں میں سے جوان اور ذرا دراز قد لڑکیاں اُس نے چن کر اپنے لیے رکھ لیں' باقی سب مَرد و زن کو غلاموں کی حیثیت سے فروخت کر دیا گیا۔ اس دور میں وحشی درندوں کی چیر پھاڑ کا تماشا دیکھنے کے لیے یہودیوں کو استعمال کیا جاتا تھا۔ باقی ماندہ یہودیوں کو فلسطین سے نکلنے کا حکم دے دیا گیا۔ اُس وقت سے ۱۹۱۷ء تک یہودی فلسطین سے بے دخل رہے ہیں۔

فلسطین پر یہود کے دعوے کی حقیقت

فلسطین پر یہودیوں کا قبضہ کتنے عرصے رہا' وہ دور مَیں نے گِنوا دیے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد تین سو برس تک ان کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں رہیں۔ پھر حضرت طالوت' حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہم السلام کے دورِ حکمرانی میں سو برس تک ان کا مستحکم قبضہ رہا۔ اس کے بعد دو سلطنتیں قائم ہوئیں اور جلد ہی پہلی سلطنت ختم ہوگئی۔ کچھ عرصے کے بعد ۵۸۷ قبل مسیح میں دوسری بھی ختم ہوگئی۔ پھر سو برس سے زائد حالت اسیری (Captivity) میں

رہے۔ پھر صرف سو برس کا دور آیا ہے جس کے دوران انہوں نے اپنی ایک عظیم الشان حکومت قائم کی۔ اس کے بعد وہاں سے نکال دیے گئے اور یروشلم منہدم کر دیا گیا۔ یہ ساری داستان مَیں نے آپ کو اس لیے بتائی ہے کہ یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ فلسطین کی سرزمین اللہ نے ہمیں دی ہے اور اس پر ہمارا پیدائشی حق ہے۔ آج بدقسمتی سے لبرل مسلمان' یہاں تک کہ بعض ''وسیع النظر'' علماء بھی ان کے اس دعوے کو تسلیم کر رہے ہیں۔ اس کے لیے قرآن کریم کے ان الفاظ کا حوالہ دیا جاتا ہے: ﴿اُدْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِیْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ (المائدۃ:۲۱) ''داخل ہو جاؤ اس ارضِ مقدس میں جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دی ہے'' لیکن یہ لکھ دیا جانا اِن معنوں میں تھا کہ اگر جہاد کر کے فتح کر لو گے تو یہ تمہاری ہوگی۔ جب انہوں نے جہاد و قتال نہیں کیا تو یہ وعدہ ختم ہو گیا اور ان سے کہہ دیا گیا: ﴿فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ﴾ (المائدۃ:۲۶) ''پس اب یہ چالیس برس تک اُن پر حرام رہے گی۔'' اس کے بعد بہت تھوڑے عرصے تک وہاں ان کا قبضہ رہا۔ ۷۰ء میں ان کو فلسطین سے نکال باہر کیا گیا تھا اور وہاں ان کا داخلہ تک ممنوع تھا۔ یروشلم کا شہر تو بالکل ہی تباہ و برباد کر دیا گیا تھا۔ قریباً ۱۵۰ سال کے بعد رومی بادشاہ ہیڈریان نے اسے دوبارہ آباد کیا اور اس کا نام ''ایلیا'' رکھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں بھی اس کا نام ''ایلیا'' تھا ''یروشلم'' نہیں تھا۔ چنانچہ حدیث کے اندر اس کا یہی نام آیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ((يَخْرُجُ مِنْ خُرَاسَانَ رَأَيَاتُ سُوْدٌ فَلَا يَرُدُّهَا شَيْءٌ حَتّٰى تُنْصَبَ بِاِيْلِيَاءَ)) (سنن الترمذی) یعنی خراسان کے علاقے سے سیاہ علَم لے کر فوجیں چلیں گی' اُن کا رُخ کوئی نہیں موڑ سکے گا یہاں تک کہ ایلیا میں جا کر وہ جھنڈے نصب ہو جائیں گے۔'' بہرحال فلسطین پر یہودیوں کا کوئی حق نہیں ہے۔ وہ دو ہزار سال پہلے یہاں سے نکال دیے گئے تھے اور اس عرصے کو وہ اپنا دَورِ انتشار (Diaspora) کہتے ہیں۔ پوری دنیا میں اُن سے شدید نفرت کی جاتی تھی۔ یورپ کی عیسائی ریاستوں کے اندر انہیں ستایا اور مارا جاتا تھا۔ ان کو شہروں میں داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی اور ان کی بستیاں شہروں سے باہر ہوتی تھیں جہاں یہ جھونپڑیوں میں رہتے

تھے۔ دِن بھر میں صرف دو گھنٹے کا وقت مقرر تھا کہ ضروریاتِ زندگی کی خرید و فروخت کے لیے آ جا سکتے ہیں۔

فلسطین پر یہودیوں کے دعوے میں عیسائیوں کا بھی ایک بہت بڑا مؤثر حلقہ اُن کا ہمنوا ہے۔ عیسائیوں کو دو فرقوں پروٹسٹنٹس اور کیتھولکس میں تقسیم کرنے والے بھی یہودی تھے‘ ورنہ اس سے پہلے سب عیسائی کیتھولکس یعنی پوپ کو ماننے والے تھے۔ پوپ کے خلاف بغاوت یہودیوں نے کرائی تھی۔ چنانچہ پروٹسٹنٹس نے پوپ کی اس حیثیت کو چیلنج کر دیا کہ وہ جو حکم دے وہ واجب الاطاعت ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے پاس بائبل موجود ہے‘ ہم خود اسے پڑھیں گے‘ خود سمجھیں گے‘ خود عمل کریں گے‘ خود قانون بنائیں گے۔ سب سے پہلے اس بغاوت کا ظہور انگلستان میں ہوا اور انگریزوں نے ’’چرچ آف انگلینڈ‘‘ کے نام سے اپنا چرچ علیحدہ کر لیا‘ جو پوپ کے تحت نہیں تھا۔ سب سے پہلا پروٹسٹنٹ ملک بھی برطانیہ تھا اور وہیں پر یہودیوں نے سب سے پہلا بینک ’’بینک آف انگلینڈ‘‘ قائم کیا۔ اس سے پہلے دنیا میں کوئی بینک نہیں تھا‘ کوئی سودی معاملہ نہیں تھا۔ پوپ کے زیر اثر کسی بھی علاقے میں سود کی اجازت نہیں تھی۔ بہرحال یہودیوں نے عیسائیوں کو پروٹسٹنٹس اور کیتھولکس میں تقسیم کر دیا‘ جیسے انہوں نے ہمیں شیعہ اور سُنّی میں تقسیم کیا ہے۔

عبداللہ بن سبا ایک بدبخت یہودی تھا جو حضرت عثمان ؓ کے دورِ خلافت میں یمن سے آیا اور اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کر کے اسلام کے خلاف سازشوں میں مصروف ہو گیا۔ اس نے آ کر یہ پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ عثمان کیسے خلیفہ ہو سکتے ہیں‘ یہ تو بنو اُمیّہ میں سے ہیں جب کہ خلافت تو بنو ہاشم کا حق ہے‘ اس لیے کہ حضرت محمد ﷺ تو ہاشمی تھے۔ لہٰذا حضرت ابوبکر بھی غاصب تھے‘ حضرت عمر بھی غاصب تھے‘ حضرت عثمان بھی غاصب ہیں (نعوذ باللہ من ذٰلک)۔ اس نے یہ فتنہ اٹھایا اور اُمّت کو دو حصوں (شیعانِ علی ؓ اور شیعانِ عثمان ؓ) میں تقسیم کر دیا۔ اُس نے اِن باطل نظریات کا پرچار کیا کہ حضرت علی (ؓ) کی ذات میں خدا نے حلول کیا ہوا ہے۔ اس طرح اس نے حضرت علی ؓ کو خدائی کے مرتبے تک پہنچا دیا۔ دوسرے یہ کہ وہ چونکہ حضور ﷺ کے قریب ترین رشتہ دار ہیں‘ بنو ہاشم میں

سے ہیں‘ لہٰذا خلافت پر اوّلین حق انہی کا ہے۔ اِس بنیاد پر اُس نے اُمّت میں تفرقہ ڈالا اور اس قدر خوں ریزی ہوئی کہ ایک لاکھ کے قریب مسلمان ایک دوسرے کی تلواروں سے قتل ہوئے۔ حضرت علی ؓ کا پورا دورِ خلافت باہمی خوں ریزی اور جنگ و جدال میں گزرا۔

سو سال پہلے تک پروٹسٹنٹس کا امام برطانیہ تھا‘ لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد سے اس کا امام امریکہ ہو گیا۔ کچھ یہودی اور پروٹسٹنٹس برطانیہ اور امریکہ کو ’’New Israel‘‘ کہتے ہیں۔ یعنی اصل میں یہ اسرائیل ہی ہے۔ وہاں پر اگرچہ بظاہر اسرائیل کا قبضہ نہیں ہے‘ لیکن کنٹرول یہود کا ہے۔ برطانوی حکومت ہو یا امریکی حکومت ہو‘ اس پر کنٹرول یہودیوں کا ہے۔ علامہ اقبال چونکہ امریکہ نہیں گئے لہٰذا وہاں کے حالات تو وہ نہیں دیکھ سکے‘ لیکن ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک انہوں نے تین سال برطانیہ اور یورپ میں گزارے اور انہوں نے وہاں دیکھ لیا کہ ع ’’فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے!‘‘ آج فرنگ کا امام امریکہ ہے‘ لہٰذا آج ’’امریکہ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے!‘‘

ارضِ فلسطین: عیسائیوں کی نظر میں

ارضِ فلسطین سے عیسائیوں کا بھی تعلق ہے۔ حضرت عیسیٰ ؑ اگرچہ ناصرہ (یا نضارت) کے رہنے والے تھے‘ لیکن جس مقام پر حضرت مریم سلامٌ علیہا کے بطن مبارک سے آپؑ کی پیدائش ہوئی وہ بیت اللحم ہی تھا۔ پھر جہاں انہوں نے تبلیغ کی وہ سارا علاقہ فلسطین ہی کا تو ہے! آپؑ گلیلی جھیل سے‘ جو بالکل شمال میں ہے‘ یروشلم تک اِس پورے علاقے میں تبلیغ کرتے رہے ہیں۔ پھر عیسائیوں کے قول کے مطابق اسی یروشلم شہر کے اندر انہیں صلیب دی گئی۔ وہ صلیب آج تک محفوظ ہے جس پر اُن کے خیال کے مطابق حضرت عیسیٰ ؑ مصلوب کیے گئے تھے۔ لہٰذا عیسائیوں کی پوری تاریخ بھی فلسطین سے وابستہ ہے اور یہودیوں کی تاریخ بھی اسی سے وابستہ ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ یہودیوں کو اللہ تعالیٰ نے جبلِ طور پر تورات دی تھی جو صحرائے سینا میں واقع ہے۔ جیسے حضور ﷺ پر پہلی وحی جبلِ نور پر غارِ حرا میں نازل ہوئی اسی طرح جبلِ طور پر حضرت موسیٰ ؑ اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے اور پھر وہیں پر اُن کو تورات دی گئی۔ عیسائیوں کی

نظر میں بھی فلسطین مذہبی اعتبار سے اہم ترین اور مقدّس ترین علاقہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے کے ایک ہزار سال بعد (جدید اصطلاح میں سیکنڈ ملینیم کے آغاز پر) انہوں نے اپنی ارضِ مقدس کو مسلمانوں کے قبضے سے واگزار کرنے کے لیے صلیبی جنگیں (Crusades) کیں‘ جن میں انتہائی خوں ریزی ہوئی۔ ان کروسیڈز کے پہلے ریلے میں‘ جبکہ مسلمان ابھی تیّار نہیں تھے‘ بحیرۂ روم کے ساحلی علاقوں میں مسلمانوں کی اکثر بستیاں تباہ و برباد ہوگئیں۔ ۱۰۹۹ء میں عیسائیوں نے یروشلم فتح کرلیا اور وہاں لاکھوں مسلمانوں کو قتل کیا۔ یورپی مؤرخین لکھتے ہیں کہ جب عیسائی فاتحین کے گھوڑے یروشلم میں داخل ہوئے تو اُن گھوڑوں کے گھٹنوں تک خون کا دریا بہہ رہا تھا۔ مسلمانوں پر ایسا عذاب آیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ ۸۸ سال بعد ۱۱۸۷ء میں اُس نے ایک مردِ مجاہد صلاح الدّین ایوبی کو اٹھایا‘ جس نے عیسائیوں کو شکست دی اور یروشلم واپس لے لیا۔ اس کے بعد بھی تین چار کوششیں ہوئی ہیں۔ کروسیڈز ایک دفعہ نہیں بلکہ کئی دفعہ ہوئے ہیں۔ اب امریکہ کے پروٹسٹنٹ عیسائی کہہ رہے ہیں کہ فیصلہ کن ’’The Last Crusade‘‘ شروع ہونے والا ہے‘ جب مسلمانوں کے ایک ایک بچے کو فلسطین سے نکال دیا جائے گا اور یہ زمین پاک کر دی جائے گی۔ ’’The Philadelphia Trumpet‘‘ کی اشاعت بابت اگست ۲۰۰۱ء میں اس کے ایڈیٹر Gerald Flurry کی طرف سے یہ عبارت شائع ہوئی ہے کہ:

"Most people think the crusades are a thing of the past —— over forever. But they are wrong. Preparations are being made for a final crusade, and it will be the bloodiest of all."

’’اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ صلیبی جنگیں تو پرانے زمانے کی ایک بات ہے‘ جواب ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکی ہیں۔ لیکن اُن کا یہ خیال غلط ہے۔ اب ایک فائنل کروسیڈ کے لیے تیاریاں ہو رہی ہیں‘ اور یہ (آخری صلیبی جنگ) پچھلی تمام جنگوں سے زیادہ خونی ہوگی۔‘‘

یہود کا ایجنڈا اور فلسطین کا مستقبل

سن ۷۰ء سے نکالے ہوئے یہودی جن کی انتہائی تعذیب (persecution) ہوئی ہے‘ اب ارضِ فلسطین پر قابض ہیں۔ پہلے کروسیڈز میں جہاں مسلمانوں کا قتل عام ہوا ہے‘ اس کے برابر یہودیوں کا بھی ہوا ہے‘ کیونکہ عیسائیوں کو یہودیوں سے بھی شدید نفرت تھی۔ ایک قوم (عیسائی) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا مانتی ہے جبکہ دوسری (یہود) انہیں حرام زادہ‘ واجب القتل‘ کافر اور مرتد ٹھہراتی ہے (نعوذ باللہ!) تو اِن دونوں قوموں میں کوئی مصالحت کیسے ہوسکتی ہے؟ یہ تاریخ کا معجزہ ہے اور یہودیوں کی محنت‘ جِدّوجُہد‘ کوشش‘ سازشی انداز‘ منصوبہ بندی اور دوراندیشی کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے عیسائیوں کو‘ جو یہودیوں کے خون کے پیاسے تھے اور اُن سے انتہائی نفرت کرتے تھے‘ رفتہ رفتہ دو فرقوں میں تقسیم کر دیا۔ پروٹسٹنٹس کو انہوں نے اپنا آلۂ کار بنایا اور آج پوری عیسائی دنیا اُن کے قبضۂ قدرت میں ہے۔

یہودیوں کا ایجنڈا کیا ہے؟ بائبل میں ہرمجدون (Armageddon) کی خبر دی گئی ہے کہ بہت بڑی جنگ ہوگی۔ وہ چاہتے ہیں کہ یہ جلد از جلد ہو جائے۔ اس جنگ کی حدیث میں بھی خبر ہے اور اسے اَلْمَلْحَمَۃُ الْعُظْمٰی اور اَلْمَلْحَمَۃُ الْکُبْرٰی کہا گیا ہے۔ تاریخِ انسانی کی یہ سب سے بڑی جنگ کئی سالوں پر پھیلی ہوگی۔ انگریزی میں جنگ کے لیے دو لفظ war اور battle استعمال ہوتے ہیں۔ war ایک بڑا لمبا پراسیس ہوتا ہے۔ اس سے ایسی جنگ مراد ہوتی ہے جو کئی سالوں پر محیط ہو۔ جیسے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور مشرکینِ مکّہ کے درمیان چھ سالہ جنگ (war) رہی‘ جس کے دوران کئی جنگیں (battles) ہوئیں۔ جنگ بدر‘ جنگ اُحد اور جنگ احزاب سب battles تھیں۔ تو تاریخِ انسانی کی سب سے بڑی جنگ (battle) اگرچہ چھوٹے سے علاقے میں ہوگی‘ لیکن خون ریزی کے اعتبار سے دنیا کی تاریخ کی کوئی جنگ اس کے مساوی نہیں ہوگی۔ یہود چاہتے ہیں کہ پہلے تو آرمیگاڈان کے نتیجے میں عظیم تر اسرائیل قائم ہو جائے۔ اس کے لیے

کوشش ہو رہی ہے۔ امریکہ نے عراق پر کیوں حملہ کیا؟ ابھی تک کوئی وجہ سامنے نہیں آ سکی۔ کوئی وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار (WMD) وہاں سے برآمد نہیں ہوئے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ تیل کے لیے کیا گیا۔ قطعاً نہیں! یہ دراصل گریٹر اسرائیل کی طرف پہلا قدم ہے۔ ۱۹۹۱ء کی خلیجی جنگ کے اتحادی کمانڈر انچیف نے بعد میں صاف کہہ دیا تھا کہ "We fought for the protection of Israel." یہودیوں کا claim ہے کہ ہم نے گریٹر اسرائیل بنانا ہے۔ پہلے کہتے تھے کہ فرات تک ہمارا علاقہ ہے' اب کہتے ہیں دریائے دجلہ بھی ہمارا ہے۔ سقوطِ بغداد کے وقت اسرائیلی وزیراعظم شیرون نے صاف کہہ دیا تھا کہ عنقریب عراق پر ہمارا قبضہ ہوگا۔ یہ ساری تیاری اس کے لیے ہے۔ یہ یہودی ہیں جو بش اور اس کے ساتھیوں کو چابی دے رہے ہیں۔

اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کا واقعہ کرنے والے بھی یہودی ہیں۔ تازہ ندائے خلافت (شمارہ ۱۵: ۲۰۰۴ء) میں عابد اللہ جان کا چشم کشا مضمون شائع ہوا ہے' جس میں انہوں نے Alex Jones کی کتاب کے حوالے سے لکھا ہے کہ نائن الیون درحقیقت CIA کا کارنامہ تھا۔ سیمپوزیم آف ملٹری اینڈ سویلین پائیلٹس کے سیمینار میں تمام پائلٹس نے یہ بات کہی کہ اس طرح کا اٹیک کسی پائیلٹ کے لیے ممکن ہی نہیں۔ امریکہ میں اب اس بارے میں کوئی تحقیق نہیں ہو رہی کہ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کا واقعہ کس نے کیا تھا! شروع میں کچھ کارروائی ہوئی تھی' لیکن اس کی بعض باتیں لیک ہونے پر معاملہ فوراً ٹھپ کر دیا گیا' کیونکہ وہ کُھرا تو اسرائیل تک پہنچ رہا تھا۔ بہرحال یہودیوں کا ایجنڈا یہ ہے کہ سب سے پہلے آرمیگاڈان جلد از جلد ہو جائے جس کے نتیجے میں گریٹر اسرائیل قائم ہو۔ وہاں پر وہ اپنا تیسرا معبد سلیمانی (Third Temple) تعمیر کریں گے' جس کے لیے مسجد اقصیٰ اور گنبد صخرہ دونوں کو گرایا جائے گا۔ تھرڈ ٹمپل کی تعمیر کے بعد وہاں پر تختِ داؤد لاکر رکھا جائے گا اور اس پر وہ ''مسیحا'' آکر بیٹھے گا جس کا انہیں انتظار ہے۔ پروٹسٹنٹ عیسائی بھی یہودیوں کے اس ایجنڈے کے ساتھ منسلک ہو گئے ہیں اور وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ آرمیگاڈان جنگ جلد ہو' گریٹر اسرائیل قائم ہو اور تھرڈ ٹمپل بنے۔

میثاق کی خصوصی اشاعت (بابت اپریل ۲۰۰۴ء) کے بیک ٹائٹل پر ہم نے ''The Philadelphia Trumpet'' سے منقول مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرۃ کی ایک تصویر اور اندرونی صفحہ پر یہود و نصاریٰ کے عزائم کے بارے میں تحریر شائع کی ہے۔

یہودی جو ''تھرڈ ٹمپل'' تعمیر کرنا چاہتے ہیں یہ ٹمپل آف ماؤنٹ کہلاتا ہے۔ یروشلم کے مشرقی علاقے کے اندر اونچی پہاڑی جگہ پر ایک بالکل ہموار میدان ہے جس کو وہ ''Temple of Mount'' کہتے ہیں۔ یہ ایک ایسی مستطیل ہے جو شمالاً جنوباً لمبی ہے لیکن شرقاً غرباً اس کی چوڑائی کم ہے۔ اس کے شمالی علاقے میں قبۃ الصخرۃ (Dome of the Rock) ہے' جو اُموی حکمران عبدالملک بن مروان اور ولید بن عبدالملک نے اس چٹان پر بنوایا تھا جس سے معراج شریف میں نبی اکرم ﷺ کا آسمانی سفر شروع ہوا تھا۔ اسی مناسبت سے مَیں نے آغاز میں اس آیۂ مبارکہ کی تلاوت کی تھی:

﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ①﴾ (بنی اسراءیل)

''پاک ہے وہ جو لے گیا ایک رات اپنے بندے کو مسجد حرام سے دُور کی اُس مسجد تک جس کے ماحول کو اُس نے برکت دی ہے تاکہ اُسے اپنی کچھ نشانیوں کا مشاہدہ کرائے۔ حقیقت میں وہی سب کچھ سننے والا' دیکھنے والا ہے۔''

اس علاقے کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرما دیا کہ اس کا ماحول ہم نے بابرکت بنایا ہے۔ اس لیے کہ سینکڑوں انبیاء وہاں دفن ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے دو ہزار برس بعد تک جتنے انبیاء کا ذکر ہمیں ملتا ہے' سب کے سب وہیں دفن ہوئے ہیں۔ اب پروٹسٹنٹ عیسائیوں اور یہودیوں کا اس بات پر گٹھ جوڑ ہے کہ یہاں تھرڈ ٹمپل تعمیر ہونا چاہیے۔

دوسری طرف پروٹسٹنٹ عیسائیوں اور کیتھولکس کے درمیان مذہب کے نام پر جتنی خوں ریزی ہوئی ہے' دنیا میں کبھی نہیں ہوئی۔ ''The Blood on the Cross'' کے نام سے ایک ضخیم کتاب شائع ہوئی تھی جس میں عیسائیوں کی باہمی خانہ جنگیوں کا ذکر ہے۔

یورپ میں اس بنیاد پر جس قدر خانہ جنگیاں ہوئی ہیں‘ اس کا آپ تصوّر نہیں کر سکتے۔ سارے پروٹسٹنٹس یہاں سے مار مار کر بھگا دیے گئے‘ جو امریکہ میں جا کر آباد ہوئے۔ یورپ کا بڑا حصّہ کیتھولکس پر مشتمل ہے۔ سپین‘ اٹلی‘ فرانس‘ جرمنی سب کیتھولکس ہیں۔ پروٹسٹنٹس یورپ سے جان بچا کر بھاگے۔ انہوں نے امریکہ کے اندر اپنی نئی دنیا بسائی ہے اور وہاں وہ غالب ہیں۔ یہاں یہودیوں کو طاقت اور کنٹرول حاصل ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہماری ذلّت اور کمزوری کا دور ختم ہوا‘ اب دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں ہماری مٹھی میں ہیں اور پوری دنیا کی اقتصادیات ہمارے کنٹرول میں ہیں۔ امریکی حکومت یہودیوں کے بینکوں کی کھرب ہا کھرب ڈالر کی مقروض ہے۔ لہٰذا اس وقت امریکہ کی رگِ جاں پوری طرح پنجۂ یہود میں ہے۔ بہرحال کیتھولکس کی چونکہ پروٹسٹنٹس کے ساتھ دشمنی ہے اس لیے درحقیقت اب یورپ میں ’’Last Crusade‘‘ کی تیاری ہو رہی ہے۔ یورپ کو دوبارہ متحد کیا جا رہا ہے‘ جیسے کبھی رومن ایمپائر ہوتی تھی اور پورا یورپ تقریباً ایک بادشاہ کے تحت ہوتا تھا۔ یہ اصل میں پوپ کی طرف سے کروایا جا رہا ہے تاکہ ایک بڑی رومن کیتھولک امپیریلزم قائم ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ پروٹسٹنٹ عیسائی پوپ کو شیطان کہتے ہیں۔ نیٹو (NATO) سے علیحدہ ہو کر یورپ کی اپنی الگ فوج بنانے کی تیاریاں بھی اسی منصوبے کا حصہ ہیں تاکہ یہ امریکی کنٹرول سے آزاد ہو سکیں۔ گویا یہ صرف اقتصادی معاملہ نہیں ہے بلکہ امریکہ اور یورپ کے درمیان ایک بنیادی معاملہ ہے۔

پروٹسٹنٹس کا کہنا یہ ہے کہ کیتھولک عیسائی فلسطین کو فتح کرنا چاہتے ہیں تاکہ یہودیوں اور مسلمانوں کو ختم کر کے وہاں پر کیتھولک عیسائی ریاست قائم ہو جائے‘ جیسے انڈونیشیا کے ایک بڑے جزیرے کو تقسیم کرا کے ایسٹ تیمور میں کیتھولک عیسائیوں کی حکومت قائم کر دی گئی۔ اسی طرح کی کوششیں نائجیریا میں بھی ہو رہی ہیں۔ وہاں پر کیتھولک عیسائی مسلمانوں کے خلاف برسرِ پیکار ہیں اور نائجیریا کے ایک بڑے حصّے پر رومن کیتھولک حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ بہرحال یہودیوں‘ رومن کیتھولکس اور پروٹسٹنٹ عیسائیوں تینوں کی نگاہ اس وقت ارضِ فلسطین پر ہے۔ ؎

الٰہی خیر میرے آشیاں کی
زمیں پر ہیں نگاہیں آسماں کی!

اس کا حل کیا ہے؟ ایک اصولی اور مبنی بر انصاف حل تو وہ ہے جو شروع سے ’تنظیم آزادیٔ فلسطین‘ (PLO) کا مطالبہ تھا‘ اور اب بھی ’حماس‘ کا مطالبہ ہے کہ اسرائیل کا قیام ناجائز طور پر ہوا تھا‘ ہمارے اوپر ظلم کر کے یہاں یہودیوں کو آباد کیا گیا‘ اس لیے اسرائیل کو ختم ہونا چاہیے اور پورے کا پورا فلسطین اس کے اصل رہنے والوں کو دیا جانا چاہیے۔ ان کے اس مطالبے میں تقریباً تمام عرب ممالک ان کے ساتھ تھے۔ لیکن اصل فیصلہ تو طاقت کرتی ہے۔ ع ’’ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات!‘‘ دنیا کی واحد سپریم پاور امریکہ اسرائیل کی پشت پر ہے۔ اہلِ یورپ سے بھی کبھی کبھی اُمیدیں باندھ لی جاتی ہیں کہ وہ کچھ یہودیوں کے خلاف اور فلسطینیوں کے حق کی بات کر دیتے ہیں‘ لیکن ان کا بھی اصل ایجنڈا یہی ہے کہ یہاں سے یہودیوں اور مسلمانوں سب کو نکال کر رومن کیتھولک حکومت قائم کی جائے۔ ؎

ہم کو اُن سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے!

جنہوں نے ہم سے صلیبی جنگیں لڑیں اور لاکھوں مسلمانوں کو تہِ تیغ کیا‘ ان سے اُمید کی جا رہی ہے کہ وہ اہلِ فلسطین کو ان کا حق دلا دیں گے!

ہمارے ہاں بھی کہا جاتا ہے کہ زمینی حقائق کو دیکھو۔ اصولی بات تو یہ ہے کہ پورا کشمیر پاکستان کا حصّہ ہے‘ لیکن بھارت آپ کو ایک انچ زمین بھی دینے کو تیار نہیں‘ لہٰذا کہا جاتا ہے کہ ’’کچھ لو کچھ دو‘‘ کی بنیاد پر بات کر لی جائے۔ بھارت سے اس سے زیادہ کوئی توقع نہیں کہ کنٹرول لائن کو مستقل سرحد بنا دیا جائے۔ اسی طرح کا معاملہ فلسطین کا ہے کہ ایک زمانہ ہوا پی ایل او اپنے اصولی موقف سے دستبردار ہو چکی ہے اور اب اس کا موقف یہ ہے کہ اچھا ٹھیک ہے‘ اسرائیل بھی رہے لیکن ایک فلسطینی ریاست بھی بن جائے۔ اب اس صورتِ حال کو بھی بارہ تیرہ سال گزر گئے ہیں۔ اس پر کبھی اوسلو‘ کبھی میڈرڈ اور کبھی

کیمپ ڈیوڈ میں مذاکرات ہو رہے ہیں‘ لیکن بظاہر اس مسئلے کا کوئی حل ہے ہی نہیں۔ اس چھوٹے سے جغرافیہ پر اتنے لوگوں کی نگاہیں ہیں اور بے چارہ مسلمان وہاں پر پٹ رہا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو موجودہ حالات میں پی ایل او کی بات بھی کسی درجے میں صحیح ہے۔ امریکہ کے سامنے سر جھکانے کے علاوہ اور کیا چارۂ کار ہے!

بہرحال صورتِ حال یہ ہے کہ ’’آرمیگاڈان‘‘ اب زیادہ دور نہیں ہے۔ اس کے لیے یورپ بھرپور تیاریاں کر رہا ہے اور متحد ہو رہا ہے۔ پوپ کی طرف سے بھی یہ بات آ گئی ہے کہ یورپ کے دستور میں لکھ دیا جائے کہ اس کا سرکاری مذہب کیتھولک عیسائیت ہے۔

آج کل ایک عجیب بات قبرص کے حوالے سے بھی دیکھنے میں آ رہی ہے۔ کوفی عنان صاحب وہاں بار بار آ رہے ہیں۔ نیٹو افواج کا صدر مقام پہلے جرمنی تھا‘ وہاں سے یہ کوسوو کی طرف منتقل ہوا۔ اب وہاں سے ان کا اگلا قدم قبرص ہے۔ وہیں اصل ’’جمپنگ پیڈ‘‘ بنے گا۔ فلسطین یہاں سے بہت قریب ہے‘ لہٰذا یہیں سے حملہ ہوگا۔ اس حملے میں اتنی خوں ریزی ہوگی کہ اس کا ہم تصوّر بھی نہیں کر سکتے‘ کیونکہ جب تک یہود مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ کو نہ گرائیں ان کا تھرڈ ٹمپل نہیں بنتا۔ قبضہ ان کے پاس ہے اور دنیا کی عظیم ترین عسکری قوت ان کی پشت پر ہے۔ اب اس سے بڑی بات کیا ہوگی کہ اسرائیلی وزیراعظم شیرون نے فیصلہ کیا ہے کہ غزہ کی پٹی پر قائم چند یہودی بستیوں کو تو ہم خالی کر دیں گے‘ جس کا رقبہ محض ۱۴۰ مربع میل ہے‘ لیکن مغربی کنارے پر ہم اپنی بستیاں نہیں گرائیں گے اور وہ یہودی علاقہ ہی رہے گا۔ مغربی کنارے کے بارہ چھوٹے چھوٹے جزیرے بھی مکمل طور پر یہودیوں کے ہو جائیں گے۔ اس طرح فلسطین کے مسلم علاقے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر جائیں گے اور یہودی جب چاہیں گے ان کے مابین مواصلات روک دیں گے۔ ان بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو ایک ریاست کی شکل کیسے دی جا سکتی ہے؟

اس سے پہلے امریکہ کا موقف یہ تھا کہ اسرائیل پورا مغربی کنارہ واپس کر دے جس پر اُس نے ۱۹۶۷ء کی جنگ میں قبضہ کیا تھا اور یہاں غزہ کی پٹی میں فلسطینی ریاست قائم کر دی جائے۔ لیکن اب صدر بش نے شیرون کے منصوبے کی نہ صرف منظوری دے دی

ہے بلکہ اس پر اسے داد بھی دی ہے۔ اس سے آگے یہ معاملہ ہوا ہے کہ صدر حسنی مبارک نے اپنے حالیہ دورۂ امریکہ کے دوران بش پر یہ واضح کیا ہے کہ مشرقِ وسطیٰ میں امن کا عمل طویل ہونے اور روڈ میپ پر اسرائیل کے کاربند نہ ہونے سے عرب دنیا میں بے چینی اور اضطراب بڑھ رہا ہے۔ عوام یہ صورتِ حال کب تک برداشت کریں گے! عرب نوجوانوں کے اندر یہودیوں کی نفرت رچی ہوئی ہے۔ لہٰذا ’’تنگ آمد بجنگ آمد‘‘ کے مصداق وہ اٹھیں گے۔ پھر Holocaust ہوگا۔ اس میں سب سے پہلے امریکہ کے ایجنٹوں کی صورت میں جو مسلمان حکمران بیٹھے ہوئے ہیں وہ اپنے نوجوانوں کو ختم کریں گے۔ ملّتِ عرب کے لیے انتہائی خوں ریز معاملہ آنے والا ہے‘ از روئے حدیثِ نبویؐ: ((وَیْلٌ لِلْعَرَبِ مِنْ شَرٍّ قَدِ اقْتَرَبَ)) (صحیح البخاری) ’’عربوں کے لیے تباہی ہے اس آفت سے جو قریب ہی آ لگی ہے۔‘‘ یہ ہے وہ ہولناک منظر جسے حضور ﷺ نے اَلْمَلْحَمَۃُ الْعُظْمٰی اور اَلْمَلْحَمَۃُ الْکُبْرٰی یعنی تاریخِ انسانی کی عظیم ترین جنگ سے تعبیر کیا ہے۔ مستقبل سوائے اس کے اور کوئی نہیں۔ کوئی راستہ نہیں ہے!

اقول قولی ھٰذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات 00

ایک مسلمان سے دین کے تین اہم تقاضے

مُطالباتِ دین

- عبادتِ رب
- فریضہ شہادت علی الناس
- فریضہ اقامتِ دین

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

صفحات: 120 قیمت: 90 روپے

سورۃ الکہف: ایک اجمالی جائزہ

خورشید انجم ☆

(جامع القرآن، قرآن اکیڈمی لاہور میں ۳ دسمبر ۲۰۲۱ء کا خطابِ جمعہ)

سورۃ الکہف ایک طویل سورت ہے اور اس کے مضامین میں بہت تنوّع ہے۔ آج کی نشست میں ہم اس کے مضامین پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں گے‘ ان شاء اللہ! نبی اکرم ﷺ کی احادیث میں اس سورت کی بہت فضیلت بیان کی گئی ہے۔ کئی احادیث ہیں جن میں دجال سے بچاؤ کے لیے سورۃ الکہف کی تلاوت کی ترغیب دی گئی ہے‘ بالخصوص جمعہ کے دن۔ ان میں پہلی دس آیات کا بھی ذکر ہے‘ آخری دس آیات کا بھی اور پوری سورت کا بھی۔ دجال کے بارے میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ہر نبی اور ہر رسول نے اپنی اُمّت کو دجال سے خبردار کیا اور مَیں آخری نبی ہوں‘ میری اُمّت میں ہی دجال کا فتنہ رونما ہوگا۔ اللہ کے نبی ﷺ نے اگر دجال سے بچاؤ کے لیے اس سورت کو پڑھنے کی تاکید کی ہے تو ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس سورت کے مضامین کیا ہیں‘ اس حوالے سے کیا خاص گفتگو اس میں کی گئی ہے۔ جہاں تک پوری سورت کا عمود ہے‘ وہ اس سورۂ مبارکہ کی آیت ۷ ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۝۷﴾

”یقیناً ہم نے بنا دیا ہے جو کچھ زمین پر ہے اسے اس کا بناؤ سنگھار‘ تاکہ ہم انہیں آزمائیں کہ ان میں کون بہتر ہے عمل میں۔“

اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا تخلیق کی ہے۔ یہ زمین بنائی ہے اور اس زمین کو ہر قسم کی زیب و زینت اور آرائش سے آراستہ کیا ہے۔ اس زیب و زینت سے اللہ تعالیٰ کا مقصد یہ ہے کہ ”ہم آزمائیں‘ پرکھیں کہ ان میں سے کون ہے جو نیک اعمال کرتا ہے۔“ دنیا کی زیب و زینت اس

☆ مرکزی ناظم تربیت‘ تنظیم اسلامی پاکستان

سورت کا عمود ہے جس کے گرد یہ پوری سورت گھومتی ہے۔ باقی اس کے پہلے اور آخری رکوع میں پوری سورت کا خلاصہ آ گیا ہے۔ اس کے ساتھ چار قصے بھی اس سورۂ مبارکہ میں بیان کیے گئے ہیں جو اسی عمود کے گرد گھومتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کسی کو دے کر آزماتا ہے اور کسی سے لے کر آزماتا ہے۔ کسی پر کوئی تکلیف آتی ہے تب آزماتا ہے‘ کسی کو اللہ تعالیٰ فراوانی دے کر آزماتا ہے۔ وہ جو داغ دہلوی نے کہا ہے: ؎

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے!

اللہ تعالیٰ یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ پروانہ کس طرف جاتا ہے۔ پہلے رکوع کا مضمون اور اسی کا ایک عکس پھر آخری رکوع میں بھی آتا ہے‘ یہی ہے کہ اللہ نے زمین پر یہ جو زیب و زینت رکھی ہے‘ یہ زیب و زینت کیا ہے؟ اس ضمن میں سب سے بنیادی چیز یہ بتائی گئی کہ: ﴿اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ﴾ (آیت ۴۶) ”یہ مال اور اولاد دُنیا کی زیب و زینت ہے“۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر ایک داعیہ رکھا ہے مال اور اولاد کا۔ انسان اسی لیے شادی کرتا ہے‘ گھر گرہستی کے جھمیلے برداشت کرتا ہے‘ اولاد ہی کے آرام و آسائش اور بہتر تعلیم و تربیت کے لیے مال کمانے کی جِدّوجُہد کرتا ہے۔ اسی زیب و زینت کے بارے میں سورۂ آل عمران کی آیت ۱۴ بہت جامع ہے:

﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ۭ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ۝۱۴﴾ (آل عمران)

”مزیّن کر دی گئی ہے لوگوں کے لیے مرغوباتِ دنیا کی محبت جیسے عورتیں اور بیٹے‘ اور جمع کیے ہوئے خزانے سونے کے اور چاندی کے‘ اور نشان زدہ گھوڑے‘ اور مال مویشی‘ اور کھیت‘ یہ سب دُنیوی زندگی کا سروسامان ہے۔ لیکن اللہ کے پاس ہے اچھا لوٹنا۔“

یہ ساری زیب و زینت کی چیزیں ہیں۔ مرد کے لیے عورت میں کشش (attraction) رکھی گئی ہے اور عورت کے لیے مرد میں۔ پھر اولاد کی محبت ہے۔ کسی سے پوچھ لیں‘ وہ یہی کہے گا کہ بس جی ہم تو یہ سب کچھ اپنے بچوں کے لیے کر رہے ہیں۔ یہ کہیں سیٹل ہو جائیں‘ ان کی دنیا

بن جائے۔ اس کے بعد سونے چاندی کا ذکر کیا گیا۔ اس کے ساتھ بینک بیلنس کو بھی شامل کر لیجیے۔ ''اور نشان زدہ گھوڑے''۔ اب گھوڑوں کا زمانہ نہیں رہا بلکہ اس کی جگہ پراڈو‘ بی ایم ڈبلیو اور اوڈی آ گئی ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا خاص نمبر لکھا ہوتا ہے 1 کے ساتھ۔ یہ خاص نمبر ہے‘ عام شخص نہیں لے سکتا۔ ''اور مویشی''۔ دیہاتی زندگی کے اندر مال مویشی کی اپنی اہمیت ہے‘ دیہاتوں میں اسے کہا ہی ''مال'' جاتا ہے۔ ''اور کھیتیاں''۔ اب وہ فارم ہاؤسز بن گئے ہیں اور مربعے ہو گئے ہیں۔ یہ سب کچھ کیا ہے؟ ''یہ سب دنیا کے برتنے کا سامان ہے''۔ اللہ تعالیٰ نے یہ سب کچھ انسان کو مثبت انداز میں فراہم کیا تاکہ دنیا کی سرگرمیاں جاری رہیں‘ نظامِ ہستی چلتا رہے‘ لیکن شیطان نے اسے منفی بنا دیا اور ہم اسی دنیا کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہو کر رہ گئے۔ اب اسی کے لیے دن رات دوڑ دھوپ ہے۔ یہ امتحان ہمیشہ سے رہا ہے۔ پتھر کے دور میں بھی یہ امتحان تھا جب ضروریات محدود تھیں‘ جبکہ اب ضروریات لامحدود ہو گئی ہیں۔ اس آزمائش میں انسان کو اس لیے ڈالا گیا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ دیکھ لے کہ انسان دنیا کا بندہ بننا چاہتا ہے یا میرا بندہ!

اسی حوالے سے آخری رکوع میں بیان کیا گیا: ﴿قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ﴿۱۰۳﴾﴾ ''کیا ہم تمہیں آگاہ کریں کہ اعمال کے لحاظ سے سب سے زیادہ خسارے میں رہنے والے لوگ کون ہیں!'' وہاں تھا: ''اَحْسَنُ عَمَلًا'' یعنی بہترین عمل کرنے والے۔ یہاں کیا ہے؟ سب سے زیادہ خسارے میں رہنے والے۔ ﴿اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ ''جن کی ساری سعی و کوشش اسی دنیا کی زندگی میں ضائع ہو گئی''۔ ﴿وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ﴿۱۰۴﴾﴾ ''اور وہ یہی سمجھتے رہے کہ ہم نے تو بڑا کام کیا ہے!'' ہم نے تو بہت کامیاب زندگی گزاری ہے! يُحْسِنُوْنَ‘ حسن سے ہے اور صُنْعًا کاریگری کرنا یا بنانا۔ پہلے ایک فیکٹری تھی‘ آج ہماری پانچ فیکٹریاں ہو گئیں۔ پروفیشن کے لیے دن رات ایک کر دیا ہے‘ ہمارا نام چلتا ہے۔ ہر شعبۂ زندگی میں یہی طرزِ عمل ہے۔ ساری زندگی اسی میں گھلا دی۔ بس یہی مقصد رہا کہ کسی طرح کچھ حاصل ہو جائے‘ ہمارا کیریئر بن جائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ ﴿بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ﴿۱۰۳﴾﴾ یہ سب سے زیادہ گھاٹے میں ہیں۔ شدّاد نے تو ایک جنّت بنائی تھی‘ آج ہر ایک نے اپنی جنّت بنائی ہوئی ہے۔ اسی دنیا کو ہم نے جنّت بنا لیا ہے۔ بڑی بڑی کالونیز ''پیراڈائز'' کے نام سے بن رہی ہیں اور بعض کالونیز کے

مین گیٹ پر لکھا ہوتا ہے: اُدْخُلُوْهَا بِسَلَامٍ آمِنِيْنَ ۔ گویا جو کچھ جنتیوں کے لیے ہوگا‘ وہ ہم نے یہیں پر بنا لیا ہے۔ ایسے میں کس کا دل چاہتا ہے کہ یہ سب کچھ چھوڑ کر قبر کے گڑھے میں جا کر پڑ جائے۔ موت کا نام سننا کوئی پسند نہیں کرتا‘ نحوست ہوتی ہے۔ ہمارے شعور میں یہ کہیں نہیں ہے کہ ہم نے مرنا بھی ہے۔ دنیاوی طور پر ہم اپنی پوری پلاننگ کرتے ہیں کہ یہ کرنا ہے‘ وہ کرنا ہے‘ لیکن اس میں موت کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ اس کے بارے میں تو ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں‘ البتہ اللہ جب چاہے گا‘ اچانک بھیج دے گا۔

سورۃ الکہف میں بنیادی طور پر چار قصے بیان کیے گئے ہیں اور وہ دنیا کی زیب و زینت اور اس کی آرائش کے گرد گھوم رہے ہیں۔ انسان دنیا کو زیادہ اہمیت دیتا ہے یا اللہ کو! پہلا قصّہ اصحابِ کہف کا ہے‘ جو بہت معروف ہے۔ یہ یہود کا سوال تھا جو مشرکین نے کیا تھا کہ اصحابِ کہف کون تھے؟ جس کے بعد یہ سورۂ مبارکہ نازل ہوئی۔ وہ کچھ نوجوان تھے جنہوں نے اللہ ربّ العزت کی وحدانیت کا اعلان کر دیا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع سماوی کے بعد ۷۰ عیسوی میں رومی جنرل ٹائٹس نے یروشلم پر حملہ کر کے اسے بالکل تباہ و برباد کر دیا۔ یہودیوں کو قتل یا ملک بدر کر دیا گیا۔ ہیکل مسمار کر دیا گیا۔ عیسائیوں کو ملک بدر تو نہ کیا لیکن انہیں حضرت عیسیٰؑ کے پیروکار اور مؤحد ہونے کی وجہ سے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جاتا۔ اسی دور میں رومن ایمپائر پر ایک بُت پرست رومی بادشاہ دقیانوس حکمران تھا۔ اُس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں پر موحد ہونے کی وجہ سے ظلم و ستم روا رکھا ہوا تھا۔ چنانچہ ان نوجوانوں کی دربار میں پیشی ہوئی اور بادشاہ نے الٹی میٹم دے دیا کہ یا تو اپنا عقیدۂ توحید چھوڑ دو‘ یا پھر موت کے لیے تیار ہو جاؤ۔ بادشاہِ وقت کے سامنے انہوں نے کھل کر رب کی وحدانیت کا اقرار کیا اور بین السطور اس کو بھی توحید کی دعوت دی۔ انہوں نے کہا کہ ہمارا رب آسمانوں اور زمین کا رب ہے اور ہم اس کے علاوہ ہرگز کسی معبود کو نہیں پکاریں گے۔

پھر انہوں نے ایک غار میں پناہ لے لی اور تین سو سال تک وہاں پر نیند کی حالت میں رہے۔ اس دوران اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت فرماتا رہا۔ قرآن مجید میں الفاظ آئے ہیں: ﴿فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا ﴿۱۱﴾﴾ ''تو ہم نے تھپکی دے دی ان کے کانوں پر غار میں کئی سال کے لیے۔'' جیسے بچے کو لوری دی جاتی ہے ان کے کانوں پر وہ

لوریاں بھی دی جاتی رہیں۔ ان کی کروٹیں بھی بدلتی رہیں۔ ان کے جسم بھی محفوظ رہے۔ روشنی بھی منعکس ہوکر آتی تھی۔ تین سو سال میں ان کو کچھ نہیں ہوا۔ پھر بیدار ہونے کے بعد وہ باہر گئے تو پتہ چلا کہ حالات تبدیل ہو چکے ہیں۔ پوری رومن ایمپائر نے عیسائیت اختیار کر لی ہے۔ پھر ان کے ساتھ پیرزادوں اور بزرگوں جیسا سلوک کیا گیا۔ اس واقعے میں سبق یہ ہے کہ ایمان زندگی کی سب سے بڑی اور بیش بہا نعمت ہے۔ جان جاتی ہے تو جائے لیکن ایمان نہ جائے۔ آج کل اگر کہیں ایس ایچ او کے سامنے پیش ہونا پڑ جائے تو خوف سے بُرا حال ہو جاتا ہے۔ عدلیہ اگر بلا لے تو ہمارے بڑے بڑے سیاست دانوں کی حالت غیر ہو جاتی ہے۔ اُس وقت کے بادشاہ نے جبر کے ساتھ انہیں بلایا اور کہا کہ آخری وارننگ ہے' سیدھے ہو جاؤ! انہوں نے جواب دیا کہ کچھ بھی ہو جائے' ایمان تو ہم نہیں چھوڑیں گے' اس ایمان پر ہم قائم ہیں۔ جب انہوں نے رب کی کبریائی کا اعلان کر دیا' بادشاہ کے سامنے ثابت قدم رہے تو پھر اللہ تعالیٰ نے بھی ان کی حفاظت کا ذمہ لے لیا اور غار کے اندر ان کو محفوظ رکھا۔ سب سے بنیادی چیز کیا ہے؟ ایمان۔ جان جائے تو جائے لیکن ایمان نہ جائے۔ آج ہمارے نزدیک ایمان کی کیا حیثیت ہے' کچھ کہنے کی ضرورت نہیں' چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہم اسے بیچ دیتے ہیں۔

دوسرا قصّہ دو دوستوں کا مکالمہ ہے جن میں ایک کے دو باغ تھے۔ وہ دو دوست تھے۔ جیسے ہمارے ہاں ہوتا ہے کہ دورانِ تعلیم اکٹھے رہے۔ پھر ایک کو وسائل مل گئے اور اس نے مزید تعلیم حاصل کی۔ سی ایس ایس کر گیا یا باہر چلا گیا۔ ایک ایک منٹ اس کا ہزاروں میں ہے اور دن کی کمائی اس کی لاکھوں میں ہو رہی ہے۔ جبکہ دوسرا دوست کسی عام جگہ پر معمولی ملازمت کر رہا ہے۔ اب ان دونوں کا مکالمہ ہو رہا ہے۔ ایک کے دو باغ ہیں جن کے گرد کھجوروں کی باڑ لگی ہوئی ہے۔ انگوروں کے باغ ہیں' ساتھ کھیتی لہلہا رہی ہے' نہریں چل رہی ہیں۔ یعنی سب کچھ موجود ہے۔ دوسرا غریب سا آدمی ہے۔ باغوں کا مالک اپنی خوش حالی میں اس قدر مگن ہوا کہ اس کی نگاہ اللہ سے ہٹ کر مادی وسائل پر ہی جم گئی اور انہی اسباب و وسائل کو وہ اپنے توکّل اور بھروسے کا مرکز بنا بیٹھا۔ وہ اپنے غریب ساتھی سے کہنے لگا کہ دیکھو میں تم سے زیادہ مال دار ہوں اور میرے بیٹے بھی زیادہ ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ میرا یہ باغ کبھی برباد ہو سکتا ہے۔ میں نے باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت اسے ہر قسم کے خطرات سے محفوظ بنا رکھا ہے۔ بات کو آگے بڑھاتے

ہوئے وہ مزید کہنے لگا کہ میں یہ گمان نہیں کرتا کہ قیامت قائم ہونے والی ہے۔ اور اگر قیامت ہوئی بھی تو میں وہاں بھی تم سے بہتر زندگی پاؤں گا اور تم وہاں بھی ایسے ہی جوتیاں چٹخاتے پھرو گے۔ اُس کے غریب ساتھی نے جواب دیا کہ یہ سارا کچھ اللہ نے تمہیں دیا ہے اور یہ سب اسی کی جانب سے ہے۔ باغ والا کہتا ہے کہ ایسا نہیں ہے' بلکہ یہ تو میرا علم ہے' میری محنت ہے' میری منصوبہ بندی ہے۔ مجھے پتا تھا کہ آگے کیسا دور آنے والا ہے۔ (جیسے آج کوئی سرمایہ دار کہے کہ یہ سب میری منصوبہ بندی ہے۔ میں نے ایک فیکٹری لگائی اور اس فیکٹری سے میں نے تین فیکٹریاں بنا لیں۔) یہ سارا کچھ میری ذہنی کاوش کا نتیجہ ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس کو قرآن مجید میں شرک کہا گیا ہے۔ مادہ پرستی شرک ہی کی ایک شکل ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

بتوں سے تجھ کو اُمیدیں' خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے!

ہندو لکشمی دیوی کو پوجتے ہیں' ہم نے بھی دولت کو ہی دیوی بنا لیا اور اسی کو پوج رہے ہیں۔ پھر جب اللہ کی جانب سے آفت آئی تو اس کے دونوں باغ بالکل اجڑ کر رہ گئے۔ ان باغوں پر اُس نے زرِکثیر خرچ کیا تھا اور مسلسل محنت کی تھی۔ اُس کا یہ تمام سرمایہ آناً فاناً نیست و نابود ہو گیا اور وہ اس کی بربادی پر کفِ افسوس ملنے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔ اُس وقت وہ کہنے لگا کہ کاش میں نے اللہ کے ساتھ شرک نہ کیا ہوتا! اس نے کسی دیوی یا دیوتا کو نہیں پوجا تھا' بلکہ اس نے اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اُس کے اختیار کو بھلا کر ظاہری اسباب اور مادی وسائل پر توکّل کیا تھا۔ گویا یہ مادّہ پرستی کا شرک تھا' جو اِس وقت بھی ہمارے معاشرے پر پوری طرح چھایا ہوا ہے۔ غریب ہو یا امیر' بے دین ہو یا دین دار' سب اس کے اندر مبتلا ہیں۔ کوئی زیادہ' کوئی کم۔

تیسرا قصّہ اس سورۂ مبارکہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر کا ہے۔ یہ بڑا معروف واقعہ ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک شخص خضر سے علم حاصل کرنا چاہتے ہیں' سیکھنا چاہتے ہیں۔ دونوں چلتے ہیں اور ایک کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو حضرت خضر کشتی میں شگاف ڈال دیتے ہیں۔ پھر ایک بستی میں جاتے ہیں تو ایک لڑکے کو بغیر کسی وجہ کے قتل کر دیتے ہیں۔ اسی طرح ایک اور بستی میں جاتے ہیں تو بستی والوں سے کھانا کھلانے کو کہتے ہیں' مگر بستی والے اتنے کٹھور دل ہیں کہ کھانے کو کچھ نہیں دیتے۔ وہاں وہ دیکھتے ہیں کہ ایک دیوار گرا چاہتی ہے تو حضرت خضر کسی

معاوضے کے بغیر وہ دیوار سیدھی کر دیتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان تمام واقعات پر سوال کیے۔ آخر کار حضرت خضر نے ان کی اصل حقیقت بتائی۔ فرمایا کہ کشتی دو غریب نوجوانوں کی تھی لیکن دوسری طرف ایک ظالم بادشاہ تھا جو اچھی کشتیوں کو قبضے میں لے لیتا تھا۔ مَیں نے اسے عیب دار بنا دیا تاکہ ان کی کشتی محفوظ رہے۔ جس نوجوان کو قتل کیا گیا' یہ بڑا ہو کر نافرمان بنتا اور اپنے صالح والدین کے لیے سوہانِ روح ہوتا۔ بڑی منتوں اور مُرادوں سے یہ لڑکا انہیں حاصل ہوا تھا لیکن اس نے بڑے ہو کر نافرمان بننا تھا۔ اللہ تعالیٰ اس کے عوض ان کو دوسرا بیٹا عطا کر دے گا۔ رہا دیوار کا معاملہ تو اس کے نیچے دو یتیم بچوں کا خزانہ ہے۔ بستی والوں کا حال آپ نے دیکھ لیا ہے کہ انہوں نے ہم مسافروں کو کھانا بھی نہیں دیا۔ یہ دیوار اگر گر جاتی تو خزانہ نکل کر باہر آ جاتا اور ان لوگوں کے قبضے میں آ جاتا۔ مَیں نے اللہ کے حکم سے اس کو برابر کیا ہے تاکہ جب یہ یتیم بچے جوان ہو جائیں تو ان کو یہ خزانہ مل جائے۔ اس سارے واقعے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ سب کچھ جو ہم دیکھ رہے ہیں اس کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی حکمتِ تکوینیہ ہے۔ ﴿بِيَدِكَ الْخَيْرُ﴾ اللہ کے ہاتھ میں خیر ہی خیر ہے۔ ہمیں بعض اوقات کچھ چیزیں بُری محسوس ہوتی ہیں' دیکھنے پر اچھی نہیں لگتیں۔ مثلاً کسی کا جوان بیٹا فوت ہو گیا تو وہ اللہ سے شکوہ کرتا ہے کہ کیا میرا ہی گھر رہ گیا تھا' میرے اوپر ہی مصیبت نے آنا تھا! لیکن اُس کے ہاں خیر ہی خیر ہے۔ بظاہر جو ہمیں شر نظر آ رہا ہے' وہ بھی دراصل خیر ہی ہے۔

اس حوالے سے ایک حدیث بھی ہے' اسی کا وہ لُبِّ لُباب کہہ لیجیے۔ حضرت سفیان ثوریؒ کا یہ قول ہے کہ ''ہمیں اسلاف سے یہ بات پہنچی ہے کہ مؤمن کو اپنے اعمال نامے میں جو نیکیاں دیکھنے کو ملیں گی وہ دکھ اور پریشانیاں ہوں گی۔'' لیکن ہمیں کوئی دکھ اور پریشانی آئے تو گھبرا جاتے ہیں' حالانکہ اسی میں ہمارے لیے خیر ہوتا ہے۔ ایسے حالات میں انسان کا رویّہ یہی ہونا چاہیے کہ اصل چیز اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ ہے جس کے تحت یہ دنیا چل رہی ہے۔ یہاں ہر چیز میں خیر ہے' خواہ ہمیں سمجھ آئے یا نہ آئے۔

چوتھا اور آخری قصہ ذوالقرنین کا ہے۔ ایک وہ کیفیت تھی کہ کچھ انتہائی غریب نوجوان بادشاہ کے جبر سے مجبور ہو کر غار میں چلے گئے تھے اور وہاں جا کر انہوں نے پناہ لی تھی۔ اب اس کے بالکل برعکس ایک بادشاہ ہے' جسے اللہ تعالیٰ نے شان و شوکت اور استیلاء عطا کیا ہے لیکن وہ

انتہائی دین دار انسان ہے۔ اللہ کا فرماں بردار بندہ اور عادل بادشاہ ہے۔ اس کا ذکر کیا گیا ہے کہ کس طرح وہ اللہ کی مخلوق کو فائدہ پہنچا رہا ہے۔ انسان چاہے کسی بھی حیثیت میں ہو' چاہے اس کے پاس کچھ نہ ہو اور چاہے دنیا کی ساری دولت ہو' اس کا رویہ کیا ہونا چاہیے یہ اس کے اندر بیان کیا گیا ہے۔ پھر اس سورت کے درمیان قصہ آدم و ابلیس بھی بیان ہوا ہے۔ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ تمام فتنوں کا محرک شیطان ہی ہے۔ وہی پھونکیں مارتا ہے اور چابی دیتا ہے۔

مختصراً یہ کہ دجال قیامت سے پہلے یہ چار فتنے لے کر آئے گا۔ ایک' لوگوں سے اپنی عبادت کا مطالبہ کرے گا۔ یہ اصحابِ کہف کو درپیش معاملہ تھا۔ دوسرا' دُنیوی اسباب و وسائل پر توکّل کے حوالے سے باغ والوں کا قصہ تھا۔ دجال کے پاس بھی جدید ترین ٹیکنالوجی ہوگی۔ حدیث میں ہے کہ وہ آسمان کو حکم دے گا کہ بارش برسا تو وہ بارش برسائے گا اور اپنے پاس موجود دُنیوی نعمتوں سے لوگوں کو دھوکا دے گا۔ یہ مال کا فتنہ ہے جس کے اندر ہم سب مبتلا ہیں۔ تیسرا' لوگوں کو بعض غیبی امور کی اطلاع دے گا۔ کسی کے مرے ہوئے باپ سے اس کی ملاقات کرا دے گا اور اس طرح کے دیگر معاملات۔ چوتھا یہ کہ زمین پر اس کا راج اور استیلاء ہوگا۔ یہ فتنہ شوکت و سلطان ہے۔ دنیا پر اس کا پوری طرح کنٹرول ہوگا۔

ان چار فتنوں کا علاج چار چیزیں ہیں جو سورۃ الکہف میں موجود ہیں۔ ایک' دین کی حفاظت کے لیے اس کے ساتھ وابستگی لازم ہے۔ قرآن کے ساتھ جڑ جاؤ! اس سورۃ میں اور اس سے پچھلی سورۃ بنی اسرائیل جس میں قرآن کا ذکر خاص طور پر آیا ہے۔ علّامہ اقبال کا بڑا سادہ سا شعر ہے: ؎

وہ زمانے میں معزّز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر!

دوسری چیز ہے نیک صحبت۔ نیک لوگوں کے ساتھ رہو! ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۱۱۹﴾ (التوبۃ)

''اے ایمان والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔''

اصحابِ کہف کے کتے کا بھی ذکر آ گیا قرآن میں اور وہ بھی ہمیشہ کے لیے امر ہو گیا۔

تیسری چیز فتنۂ مال ہے۔ اس سے حفاظت اسی طرح ہو سکتی ہے کہ دنیا کی حقیقت ہماری

سمجھ میں آ جائے۔ اس ضمن میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا ﴿۴۶﴾﴾ (الکھف)

’’مال اور بیٹے دنیوی زندگی کی زینت ہیں۔ اور باقی رہنے والی نیکیاں بہت بہتر ہیں تیرے رب کے نزدیک ثواب کے لحاظ سے بھی اور اُمید کے اعتبار سے بھی۔‘‘

یہ سب کچھ برتنے کا سامان ہے‘ جسے ’’متاع الحیٰوۃ الدنیا‘‘ قرار دیا گیا ہے۔ کفن کے اندر کوئی جیب نہیں ہوتی۔ پرانے زمانے میں کیلاش اور چترال کے علاقوں میں لوگ میت کے ساتھ اسلحہ بھی رکھ دیتے تھے۔ کیا وہ اس کو کوئی فائدہ دیتا تھا! باغ والوں کے قصے میں یہی چیز سمجھائی گئی ہے کہ اللہ پر توکّل‘ اللہ پر اعتماد‘ اللہ پر بھروسا کیا جائے۔ فتنۂ علم سے حفاظت کا ذریعہ تواضع اور انکساری ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کس طرح عاجزی اور تواضع کے ساتھ حضرت خضر سے علم حاصل کر رہے ہیں۔

چوتھی چیز فتنۂ شوکت و سلطان ہے۔ ضروری نہیں کہ ہمیں بھی بادشاہت مل جائے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو کچھ نہ کچھ اختیار دیا ہوا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ اس اختیار کو کس طرح استعمال کرتا ہے۔ کیا وہ واقعتاً اپنے آپ کو اللہ کا بندہ سمجھ رہا ہے یا جو جہاں ہے وہاں فرعون بنا ہوا ہے۔ اس کا حل اخلاص لِلّٰہ ہے۔ ہر کام کرتے ہوئے انسان دیکھے کہ یہ مَیں اللہ ہی کے لیے کر رہا ہوں! پھر وہ چاہے دفتر میں بیٹھا ہو‘ دوکان میں بیٹھا ہو‘ کھیت میں ہو‘ جہاں بھی ہوگا وہ عبادت کی حالت میں ہوگا۔ پوری زندگی اگر اللہ کی بندگی اور اس کی اطاعت محبت کے جذبے کے ساتھ ہو تو یہ عبادت ہی ہے۔ یہ ہیں وہ چار قصے اور اس سے حاصل ہونے والے اسباق۔

سورۃ الکھف میں وارد اہم ترین بات ذہن نشین کر لیجیے۔ پہلے رکوع میں فرمایا:

﴿اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ﴿۷﴾﴾

’’یقیناً ہم نے بنا دیا ہے جو کچھ زمین پر ہے اسے اس کا بناؤ سنگھار‘ تاکہ انہیں ہم آزمائیں کہ ان میں کون بہتر ہے عمل کے لحاظ سے۔‘‘

جبکہ آخری رکوع میں فرمایا:

﴿قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ﴿۱۰۳﴾﴾

’’آپؐ کہیے: کیا ہم تمہیں آگاہ کریں کہ اپنے اعمال کے لحاظ سے سب سے زیادہ

خسارے میں رہنے والے کون لوگ ہیں؟‘‘

﴿اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ﴿۱۰۴﴾﴾

’’وہ لوگ جن کی ساری سعی و جہد دنیا ہی کی زندگی میں گم ہو کر رہ گئی اور وہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔‘‘

حقیقت یہ ہے کہ یہ سارا تصنّع عارضی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان فتنوں سے بچائے اور اس کے لیے ہمیں اپنی زندگی کے رخ بدلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ میری گزارش ہوگی کہ آپ سورۃ الکھف کو اپنے جمعہ کے معمولات میں شامل کر لیجیے۔ اس کو سمجھ کر تلاوت کیجیے تاکہ پتا چل سکے کہ قرآن کیا کہہ رہا ہے۔ کم از کم اس سورت کو تفسیر کے ساتھ‘ اس کے معانی اور اس کے مفاہیم کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔

بہت سی احادیث میں ہمیں یہ وضاحت بھی ملتی ہے کہ دجالی فتنہ کے ساتھ سورۃ الکھف کی ایک خاص مناسبت ہے اور اس فتنہ کے اثرات سے محفوظ رہنے کے لیے اس سورۃ کے ساتھ ذہنی اور قلبی تعلق قائم کرنا بہت مفید ہے۔ اس مقصد کے لیے احادیث میں جمعہ کے روز سورۃ الکھف کی تلاوت کرنے کی تلقین فرمائی گئی ہے‘ اور اگر پوری سورت کی تلاوت نہ کی جا سکے تو کم از کم اس کی ابتدائی اور آخری آیات کی تلاوت کرنا بھی مفید بتایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو اس کی توفیق عطا فرمائے! آمین

❁❁❁

جہاد فی سبیل اللہ
اصل حقیقت‘ اہمیت و لزوم اور مراحل و مدارج
بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کا ایک جامع خطاب
اشاعت خاص: 60 روپے
اشاعت عام: 30 روپے

ڈاکٹر اسرار احمدؒ اور اُن کی دینی خدمت

مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ کی نگاہ میں

مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ (ڈائریکٹر حضرت شیخ الہندؒ اکیڈمی دیوبند) برصغیر پاک و ہند کی نہایت مشہور و معروف دینی اور علمی شخصیت تھے۔ آپ کے کراچی میں قیام کے دوران ۱۹/ مارچ ۱۹۸۵ء کو شیخ جمیل الرحمٰن مرحوم مولانا موصوف کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ مولانا کا محاضراتِ قرآنی (منعقدہ ۲۳ تا ۲۸/ مارچ ۱۹۸۵ء) میں شرکت کا پختہ ارادہ تھا لیکن علالت مانع رہی۔ شیخ صاحب سے ملاقات پر موصوف نے اپنے ارشادات ریکارڈ کرا دیے، نیز از راہِ کرم سوالات کے جوابات بھی عنایت فرمائے۔ یہ دونوں چیزیں قریباً لفظ بلفظ کیسٹ سے منتقل کر کے میثاق (مئی ۱۹۸۵ء) میں شائع کی گئیں اور بعد ازاں کتاب ''جماعت شیخ الہندؒ اور تنظیم اسلامی'' کا حصّہ بنیں۔

بسم اللہ الرحمن الرّحیم

ڈاکٹر صاحب کا کتابچہ یعنی ''میرے تصوّرِ فرائض دینی کا خلاصہ'' مجھے دیا گیا، اسے مَیں نے بڑی توجّہ سے پڑھا ہے۔ اور یہی نہیں بلکہ اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کی تمام تحریریں جو میثاق میں نکلتی رہی ہیں یا جو انہوں نے اپنی کتابوں میں لکھی ہیں وہ بھی میری نظر سے گزری ہیں۔ ان سب کو پڑھنے کے بعد میرا مجموعی تأثر یہ ہے کہ ہمارے ہاں عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جب کبھی کوئی شخص ایک تحریک شروع کرتا ہے تو اس کا نقطہ آغاز یہ ہوتا ہے کہ جو کام کرنے مَیں جا رہا ہوں اِس وقت تک کسی نے نہیں کیا۔ اس رویے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بجائے اس بات کے کہ وہ اپنے پیش رو اور اپنے اسلاف کے کارناموں کی تعریف و تحسین کرے اور ان کی ستائش کرے اور ان کی روشنی میں وہ یہ بتلائے کہ اس نے اپنے لیے یہ راہِ عمل متعیّن کی ہے، اس کی بجائے وہ

تنقید کرتا ہے اور اپنے لیے یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ جو کام اب تک اُمّت میں نہیں ہوا تھا وہ کرنے جا رہا ہے۔ یہ ایک عام روش ہے ان حضرات کی جو کہ تحریکِ اسلامی کے بانی ہیں، اور اس کی ایک نہیں کئی ایک مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے جب کہ وہ ایک ڈاکٹر تھے اور ان کا کیریئر میڈیکل پریکٹیشنر کا تھا اور اس میں وہ بہت کامیاب تھے، جب یہ فیصلہ کیا کہ انہیں اپنے آپ کو دینِ اسلام کی خدمت کے لیے اپنے خاص نظریے کے ماتحت جو انہوں نے مطالعۂ قرآن سے اخذ کیا ہے، وقف کر دینا ہے تو انہوں نے باقاعدہ علومِ اسلامیہ کی تحصیل کی اور بڑے غور و فکر اور دقّتِ نظر سے اپنا لائحۂ عمل طے کیا۔ پھر تاریخِ اسلام میں جو تحریکیں پیدا ہوئی ہیں ان کا انہوں نے بنظرِ غائر مطالعہ کیا، اور اس کے بعد پھر جب انہوں نے کام شروع کیا تو نہایت ہی عاجزی اور انکساری کے ساتھ کیا۔ کوئی تعلّی نہیں ہے، کوئی انانیت نہیں ہے، اس میں اپنی بالا خانی نہیں ہے ——— تو یہ ایک خاص چیز ہے جس نے مجھے ڈاکٹر صاحب کے متعلق بہت ہی متأثر کیا۔

ڈاکٹر صاحب جو کچھ بھی فرماتے ہیں اور لکھتے ہیں وہ کھلے دل سے لکھتے ہیں اور لوگوں کو پھر دعوت دیتے ہیں کہ اس پر اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ جو لوگ ان کے معترضین ہوتے ہیں ان کا وہ بڑی خوش دلی کے ساتھ بغیر کسی بیزاری کے اور ناگواری کے جواب دیتے ہیں اور ان کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں مَیں یہ عرض کروں کہ مولانا اخلاق حسین قاسمی صاحب اور ڈاکٹر صاحب کی جو خط و کتابت ہوئی ہے اس میں ڈاکٹر صاحب کی زبان سے ایک تقریر میں یہ لفظ نکل گیا تھا کہ مَیں نیم مقلّد ہوں، مولانا اخلاق حسین صاحب کو ناگوار گزرا اور انہوں نے اس پر اعتراض کیا۔ لیکن میرا اپنا خیال یہ ہے کہ اگر ڈاکٹر صاحب نیم مقلّد نہ کہتے بلکہ یہ کہتے کہ میرا تقلید کے معاملے میں وہی رویّہ ہے جو حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا تھا اور جو شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا تھا تو بات نہ بگڑتی۔ وہ محض نیم مقلّد کے معنی کچھ سے کچھ سمجھے۔ چونکہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے آپ کو حنفی لکھتے ہیں، لیکن اس کے باوجود انہوں نے لکھا ہے اور وہ یہ کہتے ہیں کہ میرا مسلک جو ہے وہ ''تلفیق بین المذاہب'' ہے۔ یعنی مَیں ہوں حنفی، لیکن اگر مَیں کہیں دیکھتا ہوں کہ امام شافعیؒ کا مذہب قابلِ ترجیح ہے تو مَیں اس کو اختیار کر لیتا ہوں۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحب کی کتابوں میں اس کی ایک نہیں دسیوں مثالیں ملیں گی۔ تو صرف ایک

تعبیر کی وجہ سے بات کچھ سے کچھ ہوگئی‘ ورنہ ڈاکٹر صاحب اگر یہ کہہ دیتے تو میرے نزدیک بالکل درست تھا۔

بہرحال یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ ڈاکٹر صاحب میں بڑی عاجزی اور انکساری ہے‘ خلوص اور للّٰہیت ہے‘ اپنے بزرگوں کا احترام ہے۔ وہ یہ بتلاتے ہیں کہ جو کام مَیں کرنے جا رہا ہوں وہ ہمارے بزرگ برابر کرتے رہے‘ لیکن زمانے کے حالات کے زیرِ اثر بعض ایسی چیزیں پیش آئیں کہ وہ اپنے راستے سے ہٹ کر ایک دوسری طرف لگ گئے۔ تو یہ ایک الگ چیز تھی اور یہ حقیقت بھی ہے کہ وہ چیزیں جاری نہیں رہ سکیں۔ اب ڈاکٹر صاحب نے ع ’’من از سرِ نو جلوہ دہم دار و رسن را!‘‘ کے مصداق اسی کام کو آگے بڑھانا شروع کیا ہے اور اس کے لیے مستقل ایک تنظیم انہوں نے قائم کی ہے۔

تنظیم کے سلسلے میں یہ عرض کرنا ہے کہ یہ ایک بڑی اہم بات ہے کہ انہوں نے تنظیم کے مقاصد میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو بہت اہم درجہ دیا ہے۔ میرا اپنا ذاتی خیال یہ ہے کہ تبلیغ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر ان دونوں کے درمیان عام و خاص کی نسبت ہے۔ یعنی جہاں کہیں بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پایا جائے گا وہاں تبلیغ ضرور ہوگی‘ لیکن جہاں تبلیغ ہو وہاں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کتنے ہمارے مبلّغین ہیں‘ کتنے عمائدین تبلیغ ہیں جو تبلیغ کرتے ہیں‘ لیکن ان کے سامنے منکرات و منہیات ہوتے رہتے ہیں‘ اس کے لیے وہ کچھ بھی نہیں کرتے اور کچھ نہیں کہتے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ امر بالمعروف کے ساتھ نہی عن المنکر کا بھی قرآن نے حکم دیا ہے اور حدیث شریف میں تو سب سے زیادہ زور نہی عن المنکر پر ملتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے قرآن نے اِس اُمّت کو خیر اُمم کہا ہے: ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (آل عمران:۱۱۰) اور اسی طرح فرمایا: ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ﴾ (البقرۃ:۱۴۳) تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ جو نسبت ہمارے رسولؐ کو ہمارے ساتھ ہے وہی نسبت ہم کو دنیا کی تمام قوموں کے ساتھ ہے‘ یعنی جو حضور ﷺ کا فریضہ تھا‘ جس طرح سے کہ آپؐ نے دینِ حق ہم تک پہنچایا اور ہم کو ایک قوم بنایا‘ اب ہمارا فرض ہے کہ اُسی کو لے کر ہم آگے چلیں اور

اُسے دوسروں تک پہنچا دیں۔

تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بہت ہی اہم چیز ہے جسے قرآن کریم میں بہت اہم کام قرار دیا گیا ہے۔ اس کے لیے محض تبلیغ کافی نہیں ہے‘ بلکہ اس کے لیے مستقل ایک تنظیم ہونی چاہیے اور مجھے نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہماری پوری تاریخ اسلام میں قرونِ اولیٰ کے اندر تو اس کا کچھ نشان ملتا ہے کہ وہاں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے کچھ ادارے تھے لیکن اس کے بعد کہیں نظر نہیں آتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تبلیغ بھی ہوتی رہی‘ درسِ قرآن بھی ہوتا رہا‘ درسِ حدیث بھی ہوتا رہا‘ علماء بھی پیدا ہوتے رہے لیکن سماج برابر بگڑتا رہا۔ اسلامی سماج میں جو خرابیاں پیدا ہونی شروع ہوئیں وہ برابر پھیلتی رہیں اور یہاں تک کہ اس بگاڑ کا نتیجہ آج ہم دیکھ رہے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ اصل میں یہی ہے کہ ہم نے امر بالمعروف بالخصوص نہی عن المنکر جیسی چیز کو چھوڑ دیا ہے۔ لہٰذا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ایک اساسی اور بنیادی حیثیت سے اپنے پروگرام میں شامل کرنے کی بنا پر مَیں سمجھتا ہوں کہ یہ وہ چیز ہے جو اصل میں خود قرآن کا مطلوب اور مقصود ہے۔

اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ یہ کام تمام مسلمان تو نہیں کر سکتے‘ حالانکہ ہے تو سبھی کا فریضہ۔ اس بنا پر اس کو فرضِ کفایہ بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ﴾ (آل عمران:۱۰۴) یعنی تم سب تو نہیں کر سکتے۔ اپنی اپنی جگہ پر تو ہر ایک کو کرنا ہے: ((كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ)) یعنی تم میں سے ہر شخص راعی ہے اور اپنی رعیت کے متعلق اس سے سوال کیا جائے گا۔ باپ اپنی اولاد کے اوپر ہے‘ استاد اپنے شاگردوں کے اوپر ہے۔ یوں تو اپنی انفرادی زندگی میں ہر مسلمان راعی ہے ہی‘ لیکن قرآن مجید ﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ﴾ بھی کہتا ہے۔ اُس کے معنی یہ ہیں کہ ایک ایسی 'Organization' ہونی چاہیے‘ مستقل طور پر ایک ایسی جماعت ہونی چاہیے جو اپنے آپ کو وقف کر دے اس کے لیے۔ اور اس کا کام کیا ہوگا! امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔ تو گویا یہ جو خود قرآن کے نزدیک بڑی اہم اور بنیادی چیز ہے ڈاکٹر صاحب نے اس کو اپنی تنظیم میں شامل کر کے ایک اتنا بڑا اہم اقدام کیا ہے جو کہ میرے خیال میں اب تک بہت کم لوگوں کے لیے قابلِ توجّہ رہا ہے۔ اور اس بنا پر مَیں سمجھتا ہوں کہ ہر مسلمان کا یہ فرض ہے کہ اس میں ڈاکٹر

صاحب کی اعانت کرے‘ قدمے‘ دامے‘ درمے جس طرح سے بھی ہو۔ اور مجھے توقع ہے کہ یقیناً ان شاء اللہ تعالیٰ یہ ادارہ بہت ہی اہم‘ مفید اور اسلام اور دین کے لیے بہت ہی زیادہ نفع بخش ثابت ہوگا۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ oo

سوال و جواب

سوال: مولانا! مَیں سب سے پہلے تو آپ کی خدمت میں ہدیۂ تشکّر پیش کرتا ہوں کہ آپ نے اپنے قیمتی خیالات سے مستفید فرمایا۔ ہماری خواہش تو یہ تھی کہ آپ بذاتِ خود بنفسِ نفیس محاضرات میں شرکت فرماتے‘ لیکن آپ کی علالت کی وجہ سے یہ ممکن نہیں رہا‘ مگر ہمارے لیے یہ بہت بڑی سعادت ہے کہ آپ کے خیالات اس طرح سے ٹیپ ہو گئے ہیں۔ چند چیزیں ایسی ہیں کہ جن کے بارے میں مَیں آپ کی رہنمائی کا طالب ہوں۔ ایک چیز تو اشارۃً آپ کی اس گفتگو میں آ گئی ہے کہ اُمّت کے برپا کرنے کے مقاصد میں اہم ترین مقصد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ گویا پوری اُمّت کے سپرد یہ کام کیا گیا ہے اور اُمّت بحیثیت اُمّت جب اس کام سے غافل ہو جائے تو خود ہی قرآن رہنمائی فرماتا ہے کہ: ﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ﴾ تو اس سے یہ بات معلوم ہو رہی ہے کہ ایک گروہ تو ایسا ہونا قرآن کے نزدیک ضروری ہے‘ لازم ہے کہ جو اسی فریضے یعنی دعوت الی الخیر کو انجام دے۔ اس دعوت الی الخیر میں جملہ ایمانیات کی دعوت‘ اعمالِ صالحہ کی دعوت‘ تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کی دعوت سب شامل ہو ہی جاتی ہے۔ پھر اس جماعت کا اہم کام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں حصر کے اسلوب میں فرمایا ہے: ﴿وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۱۰۴﴾ (آلِ عمران) ’’یہی لوگ ہیں کہ جو کامیاب ہوں گے۔‘‘

مَیں نے جہاں تک سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ یہ لوگ دنیا میں بھی کامیاب ہوں گے اور آخرت میں تو ان شاء اللہ کامیابی اور اللہ کی رحمت ان کے شاملِ حال ہوگی اور وہ اللہ کی رحمت کے سائے میں جگہ پائیں گے۔ لیکن ہمارے ہاں بعض حضرات جماعت سازی کو صحیح نہیں سمجھتے۔ اور اس کی وجہ بھی ہے کہ کچھ تلخ تجربات ایسے ہیں کہ جو جماعتیں کسی اچھے کام کے لیے بنتی ہیں وہ آگے جا کر

کوئی نہ کوئی ایسی صورت اختیار کر لیتی ہیں کہ جو اُمّت میں تفرقے کا باعث ہوتی ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یہ امکان موجود رہتا ہے‘ لیکن ظاہر بات ہے کہ جب ہم کوئی کام اور خاص طور پر دین کا کام کرنے کے لیے اُٹھیں گے تو کوئی نہ کوئی ہیئتِ اجتماعیہ ہمیں بنانی پڑے گی۔ اب سڑک پر حادثات ہوتے ہیں تو لوگ حادثات کی وجہ سے سڑک پر چلنا تو نہیں چھوڑ دیتے۔ انسان کی نیت اگر اللہ کی رضا کا حصول ہے اور وہ یہ کام خلوص کے ساتھ کر رہا ہے تو بہرحال جو لوگ اخلاص کے ساتھ کام کریں گے وہ تو‘ ان شاء اللہ‘ اللہ کے ہاں ماجور ہوں گے۔ اب ایک امکان اور اندیشے کی وجہ سے ایسی جماعتوں کے متعلق تشویش میں مبتلا ہو جانا کیا آپ کے نزدیک صحیح ہوگا؟

جواب: میرے نزدیک تو لوگ جماعت کے بنانے سے غالباً اس لیے ڈرتے ہیں کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ عام طور پر تجربہ یہ رہا ہے کہ جو جماعت بنتی ہے وہ آگے جا کر تحزّب کے اندر مبتلا ہو جاتی ہے۔ تحزّب کے معنی یہ ہیں کہ ہم چو ما دیگرے نیست! لیکن یہ ضروری ہے۔ ﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ﴾ کا صاف مطلب یہ ہے کہ جماعت تو ہونی چاہیے‘ یقیناً ہونی چاہیے‘ لیکن اب جو جماعت ہے ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ کیا اس سے تحزّب کا خطرہ ہے! کیا وہ اپنے اندر کوئی ایسی انانیت پیدا کرے گی کہ وہ یہ کہے گی کہ راہِ حق پر بس ہم ہی ہیں‘ دوسرے اس پر نہیں ہیں! تو مجھ کو اس بات کا یقین ہے کہ ہمارے ڈاکٹر صاحب قبلہ جس طرح تنظیم اسلامی کا کام لے کر چل رہے ہیں اور جو خود ان کی اپنی فطرت ہے‘ جو خود ان کی افتادِ طبع ہے‘ جو خود ان کا مزاج اور ان کی طبیعت ہے وہ ہم کو اس بات کا یقین دلاتی ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ‘ یہ جماعت تحزّب سے الگ تھلگ رہے گی اور اپنا کام برابر اسی طرح پر کرتی رہے گی۔ پھر میرے خیال میں جماعت تو ہونا ضروری ہے۔ یہ یقینی بات ہے کہ بغیر 'organization' کے کام نہیں ہوگا۔ 'organization' تو ضروری ہے‘ لازمی ہے‘ لیکن 'organization' سے جو لوگ عام طور پر کچھ مشتبہ ہوتے ہیں وہ اس وجہ سے ہوتے ہیں۔ اور اگر اس کا ان کو اطمینان ہو جائے کہ نہیں یہ جماعت مخلصوں کی جماعت ہے‘ یہ جماعت مؤمنینِ قانتین کی جماعت ہے‘ یہ جماعت ان لوگوں کی ہے جن کے اندر کسی قسم کا کوئی تحزّب نہیں ہے جس کو کہ قرآن نے خود condemn کیا ہے اور فرما دیا ہے: ﴿كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۝۳۲﴾ (الروم) یہ بات واضح ہے کہ جو شخص خود قرآن کی تعلیمات کو اس طرح پر عام کر رہا ہو وہ اس سے بے خبر نہیں ہو سکتا ہے کہ تحزّب سے بچنا بہت ضروری ہے۔ اب

تک جو کچھ بھی ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے اس سے ہرگز بھی یہ بو پیدا نہیں ہوتی کہ کہیں جا کر ان کی تنظیم تحزّب کا شکار ہو جائے گی۔

سوال: اس میں کوئی شبہ نہیں کہ الحمدللہ ڈاکٹر صاحب کو اللہ تعالیٰ نے یہ توفیق عطا فرمائی ہے کہ انہوں نے جب تنظیم کے قیام کا فیصلہ کیا تو بہت واضح طور پر اس بات کا اعلان کر دیا کہ ہرگز ہرگز ہماری جماعت ''الجماعۃ'' کے حکم میں نہیں ہے۔ ''الجماعۃ'' تو یہ پوری اُمّت ہے' اور ہماری جماعت میں شامل ہونا اسلام میں شامل ہونا نہیں ہے' بلکہ اسلام کے عائد کردہ فرائض کو اجتماعی طور پر ادا کرنے کے لیے ہم جمع ہو رہے ہیں۔ اسی طرح اگر کسی کو مجھ پر' میری جماعت اور تنظیم پر اعتماد نہ رہے تو اس کا علیحدہ ہو جانا ہرگز ہرگز اسلام سے باہر نکلنا نہیں ہے۔ تو یہ وضاحتیں ڈاکٹر صاحب نے ایک بار نہیں کئی بار کی ہیں اور ہماری مطبوعات میں موجود ہیں۔ اسی طرح تنظیم کے رفقاء کو اُن کی ہدایت ہے کہ جو جس مسلک پر ہے اس پر وہ شرحِ صدر کے ساتھ عمل کرے۔ تو ان وضاحتوں کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب: یہی وہ چیزیں ہیں جو اس بات کی ضمانت ہیں کہ یہ جماعت' ان شاء اللہ تعالیٰ' اس سے (مراد ہے تحزّب) بالکل محفوظ رہے گی۔

سوال: مولانا! ایک اور مسئلہ ہے جس میں رہنمائی مطلوب ہے کہ عام طور پر ہمارے ہاں یا تو ادارے اور انجمنیں ہیں' جو 'associations' کی طرز پر محدود کام کر رہے ہیں۔ کوئی تعلیمی کام کر رہا ہے اور کوئی تحقیقی کام کر رہا ہے' لیکن اگر کوئی انقلابی کام پیش نظر ہو جس میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سرفہرست ہو تو ظاہر بات ہے کہ اس کے لیے تو جماعت بنے گی۔ تو اس کی جماعتی ہیئت کے لیے ایک طریقہ تو وہ ہے جو ہم نے مغرب سے اخذ کیا ہے' یعنی اس کے کچھ ممبرز ہوں' پھر وہ ووٹوں سے اپنا کوئی سربراہ یا صدر منتخب کریں۔ ہم جب تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں اس طرز کی کوئی دینی تنظیم سلف میں نظر نہیں آتی' بلکہ ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے میں کوئی داعیہ پیدا کرتا ہے' وہ اٹھتا ہے اور لوگوں کو بلاتا ہے کہ مَیں اس کام کے لیے اٹھا ہوں۔ جیسے کہ سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کھڑے ہوئے' انہوں نے دعوتِ جہاد دی' جن لوگوں نے بیعت کی وہ ان کی جماعت میں شامل ہو گئے۔ تو ہمیں سلف سے یہی ملتا ہے کہ اس طرز پر وہ جماعت قائم ہوتی ہے جو خالص اسلام کے لیے بن رہی ہو۔ انتخابی اور صدارتی طرز کی

تنظیم ہمیں سلف میں نظر نہیں آتی۔ کیا آپ اتفاق فرمائیں گے کہ ایسی تنظیم جو اعلاءِ کلمۃ اللہ یا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے بنے وہ بیعت کی بنیاد پر بنے؟

جواب: جی ہاں' جماعت کے جو معنی ہیں یعنی جو جماعت ہم بنائیں گے' یقیناً اس کا ایک امیر جماعت ہوگا اور امیر جماعت پر اعتماد کر کے آپ کو اپنا کام کرنا ہوگا۔ تو ویسے اعتماد کی شکل کیا ہے! اعتماد کی شکل یہی ہے کہ بیعت کی جائے اور میرے خیال میں تو ہر امیر کو اس بات کا حق حاصل ہے۔ امر کے معنی یہ ہیں کہ وہ جو اس معاملے میں رہنمائی کر رہا ہے وہ سب کے لیے قابلِ قبول ہے۔ تو اس بنا پر تو میرے نزدیک اس میں کوئی خرابی نہیں ہے' بلکہ یہ تو لازمی ہو جاتا ہے۔

سوال: مولانا جزاک اللہ! آپ نے یہ مسئلہ صاف کر دیا۔ اب ایک مسئلہ یہ ہے کہ بعض ہمارے اہلِ علم اس بات پر اشکال پیدا کرتے ہیں کہ بیعت صرف خلافت کے لیے ہو سکتی ہے یا پھر جو بیعت رائج ہے وہ صرف بیعت ارشاد ہے' وہ لی جا سکتی ہے۔ بیعت سمع وطاعت لینے کا کسی کو حق حاصل نہیں ہے' جبکہ ڈاکٹر صاحب کا موقف یہ ہے کہ ہم نے قرآن کا' اسلام کا' سیرتِ مطہرہ کا اور پوری تاریخ کا جو مطالعہ کیا ہے اور معروضی مطالعہ کیا ہے تو یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ایک بیعت تو وہ ہے کہ جب اسلامی نظام قائم ہو تو خلیفہ اپنی ذات میں کیسا ہی کیوں نہ ہو لیکن اگر شریعت کے مطابق عدالتیں قائم ہیں' شریعت کا نفاذ ہے' اسی کے مطابق انفرادی و اجتماعی معاملات چل رہے ہیں تو اُس وقت تو صحیح ہے کہ سربراہ کی بیعت ہوگی اور اس کے درمیان میں کوئی شخص بھی اپنی بیعتِ سمع وطاعت لینے کے لیے کھڑا ہوگا تو وہ خروج کی تعریف میں آ جائے گا' اِلّا یہ کہ وہ شرائط جو فقہاء نے عائد کی ہیں وہ پوری ہو رہی ہوں جو بہت مشکل ہے۔ لیکن جب خلافت کا ادارہ بالکل درہم برہم ہو جائے اور کسی ملک میں بھی اسلامی نظام' اسلامی حکومت اور شریعت کا نفاذ معمولی شکل میں بھی نظر نہ آئے تو اُس وقت اس ملک کے اندر پُرامن طریقے سے اسلامی نظام کو قائم کرنے کے لیے اگر کوئی شخص بیعتِ سمع و طاعت لیتا ہے تو آیا اس پر اُن احادیث کا اطلاق ہوتا ہے؟ میرے ناقص مطالعے کے مطابق تو ان کا اطلاق صرف اس وقت ہوتا ہے جب کہ خلافت کا ادارہ اور اسلامی نظام کا ادارہ بالفعل قوتِ نافذہ کے ساتھ اس ملک میں نافذ و رائج ہو۔ اس سلسلے میں کچھ رہنمائی فرمائیں۔

جواب: بات یہ ہے کہ بیعت کے تو معنی یہ ہیں کہ ہم نے ایک شخص کو اپنا امیر بنا لیا ہے' وہ ہمارا

سربراہ ہے‘ اس معاملے میں اور اس کے لیے جو کچھ بھی وہ ہم سے کہے گا قرآن وسنّت کی روشنی میں تو ہم اُس کی بات مانیں گے۔ دیکھئے یہ تو ایسا ہے کہ خلیفہ سے بیعت ہو رہی ہے‘ لیکن جناب عالی! لَا طَاعَۃَ اِلَّا فِیْ مَعْرُوْفٍ —— کیسی ہی آپ نے بیعت کر لی ہو‘ لیکن اگر وہ کوئی ایسی بات کہہ رہا ہے جو کہ معروف کے خلاف ہے تو مت کرو۔ صاف طور پر‘ بالکل کھلی بات ہے۔ اچھا‘ ویسے مجھے معلوم ہے کہ ایک مرتبہ پنجاب میں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کو امیر شریعت بنایا گیا تھا اور کسی اور نے نہیں بلکہ خود میرے استادِ محترم حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی تھی‘ حالانکہ ہم لوگوں کو تعجب بھی ہوا کہ شاہ صاحب عطاء اللہ شاہ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں‘ لیکن شاہ صاحب نے ان کو مانا۔ گویا کوئی بھی تنظیمی کام اس کے بغیر چل ہی نہیں سکتا ہے۔ طاعت کے بغیر چل ہی نہیں سکتا ہے۔ فوج بھی جو ہوتی ہے اس کا ایک کمانڈر انچیف ہوتا ہے‘ اس کے ماتحت ہوتی ہے اور وہ واجب الاطاعت ہوتا ہے۔ تو بیعت ایک اصطلاحی لفظ ہے۔

بیعت کے معنی بالکل یہ نہیں ہیں کہ ہر بات مانی جائے گی‘ بلکہ مجھے اس کا افسوس ہوتا ہے کہ تصوّف میں جا کر بیعت کے معنی بالکل بگڑ گئے۔ یعنی ایک وقت وہ تھا جب بیعت کا مفہوم یہ تھا کہ ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں اور آپ ہمارے مرشد ہیں‘ ہمارے رہنما ہیں‘ لیکن اس میں آگے بڑھ کر اتنا غلو کیا گیا کہ مرشد کے حکم کے برخلاف اگر اسلام کا کوئی حکم ہے تو لوگوں نے اس کی پرواہ نہیں کی (اِلّا ماشاء اللہ) حالانکہ یہ چیز بالکل غلط ہے۔ وہ تو حضرت عمرؓ تک نے فرمایا کہ دیکھو تم نے میرے ہاتھ پر بیعت کی ہے‘ لیکن اگر میں غلطی کروں تو فوراً تم مجھے مطلع کر دینا اور ایسے دسیوں بیسیوں واقعات ہیں۔ وہ تو جب حضور ﷺ نے فرما دیا کہ خواہ کتنا ہی بڑا تمہارا کوئی امام ہو‘ اگر معروف کے خلاف وہ تم کو کوئی حکم دے رہا ہے تو اس کی اطاعت تمہارے اوپر ضروری نہیں ہے بالکل ”لَاطَاعَۃَ“ اُس کی اطاعت کرنی ہی نہیں ہے۔ ایک طرف اسلام‘ جو بیعت کرنے والے ہیں ان کو آزادی دیتا ہے کہ تم خود اس کو دیکھتے رہو امیر کو‘ اور دوسری طرف یہ کہ قرآن اور سنّت کی تعلیمات کے دائرے کے اندر رہ کر جو امر بالمعروف یا نہی عن المنکر کر رہا ہے اس کی اطاعت تمہارے اوپر ضروری ہوگی۔ یہ دونوں چیزیں اگر ہوں تو اس کے اندر کوئی حرج نہیں ہے۔ بلکہ مَیں تو سمجھتا ہوں کہ کوئی تنظیم اس کے بغیر چل ہی نہیں سکتی جب تک کہ ایک شخص کے اوپر آپ مکمل اعتماد نہ کریں اور اس کو امیر نہ بنائیں۔ اور امیر بنانے کے معنی یہ ہیں کہ

آپ نے اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ لہٰذا اس سے لوگوں کا بھڑکنا صرف اس لیے ہے کہ ہماری تاریخ اسلام میں اس بیعت کو بہت غلط معنی میں استعمال کیا گیا ہے‘ اگر صحیح معنی میں استعمال کیا جائے تو بغیر اس کے کوئی تنظیم چل ہی نہیں سکتی‘ یہ تو ضروری ہے۔

سوال: مولانا! ایک بات اور ہے کہ عام طور پر بات کہی جاتی ہے کہ دین کا کام کرنے اور درسِ قرآن دینے کا حق صرف اس شخص کو حاصل ہے جو کسی دارالعلوم سے باقاعدہ سند یافتہ ہو اور کسی بزرگ ہستی کا فیض یافتہ ہو۔ ڈاکٹر صاحب پر عام طور پر یہ اعتراض وارد کیا جاتا ہے۔ جب کہ ایک شخص خود محنت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو فہم دیتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جس کو بھی ذہانت ملتی ہے وہ اللہ کی ودیعت کردہ ہوتی ہے‘ انسان کی خود اپنی تو پیدا کردہ نہیں ہوتی۔ اب اگر وہ اپنی ذہانت وفطانت کو اللہ کے دین کے لیے صَرف کرتا ہے‘ محنت کرتا ہے‘ مطالعہ کرتا ہے‘ لوگوں کی خدمت میں جاتا ہے‘ غور وفکر اور افہام وتفہیم سے ایک رائے بناتا ہے‘ اور اس کا جو اپنا اندرونی جذبہ ہے وہ اُسے اس بات پر اُبھارتا ہے کہ میرا دین مجھ سے یہ مطالبہ کرتا ہے اور پھر وہ دین کی خدمت کے لیے اپنی زندگی کو وقف کر دیتا ہے‘ لوگوں کو اس طرف دعوت دیتا ہے۔ اس پر یہ اشکال اور یہ اعتراض کہ وہ کسی دارالعلوم کا سند یافتہ اور فارغ التحصیل نہیں ہے اور کسی سے اس نے فیض حاصل نہیں کیا یعنی اپنا تزکیہ نہیں کرایا اُسے درسِ قرآن دینے اور بیعت لینے کا حق نہیں ہے۔ تو آیا دین کے کام کے لیے یہ شرائط قرآن وسنّت سے عائد ہوتی ہیں یا یہ لوگوں نے بطور احتیاط خود عائد کی ہوئی ہیں۔ آپ اس میں کیا رہنمائی فرمائیں گے؟

جواب: سوال یہ ہے کہ جب تک یہ مدارس قائم نہیں ہوئے تھے اس وقت تک جو حضرات درسِ قرآن کا کام کرتے تھے‘ درسِ حدیث کا کام کرتے تھے وہ کس طرح پر کرتے تھے! ان کو کون سی اتھارٹی حاصل تھی!! بات یہ ہے کہ وہ تو ایک وسیلہ اور ذریعہ ہے‘ مقصود تو نہیں ہے۔ اور اگر آپ یہ قید لگا دیں کہ وہ کسی مدرسے کا فارغ ہوگا‘ کسی دارالعلوم کا سند یافتہ ہوگا جہاں اس نے باقاعدہ استادوں سے تعلیم پائی ہوگی صرف اُسی کو حق حاصل ہے تو مَیں سمجھتا ہوں کہ ایک نہیں کئی ایک بڑے بڑے نامی گرامی جو علماء تھے‘ جنہوں نے بڑھ کر کام کیے ہیں‘ وہ بھی سب نکل جائیں گے اور خارج ہو جائیں گے۔ وہ تو صرف یہ ہے کہ آپ کو دیکھنا یہ ہے کہ جو کچھ بھی وہ لکھ رہا ہے‘ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے اس پر آپ اعتراض کیجئے۔ لیکن یہ کہ خود وہ ذاتی طور پر کسی مدرسے سے فارغ

التحصیل نہیں ہے تو یہ تو کوئی چیز نہیں ہے‘ یہ تو کوئی معیار نہیں ہے۔ بہت سارے خدا کے بندے ایسے ہیں کہ انہوں نے اپنے والد سے چند سبق پڑھے اور جا کر بیٹھ گئے۔ خود ابوالکلام آزاد کے متعلق آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہ کون سے مدرسے سے فارغ التحصیل تھے! مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے متعلق آپ جانتے ہیں کہ کون سے مدرسے سے فارغ التحصیل تھے! تو ایک نہیں کتنی ہی آپ کو مثالیں ملیں گی کہ انہوں نے ابتدائی کچھ کتابیں پڑھیں اور اس کے ذریعے پھر کچھ مطالعہ کیا اور یہ کیا اور وہ کیا۔ اور پھر جہاں تک کہ ڈاکٹر صاحب کا تعلق ہے تو ڈاکٹر صاحب نے تو صاف طور پر لکھا ہے کہ وہ شروع سے اس میں لگے ہی رہے‘ برابر لگے رہے‘ پڑھتے رہے‘ لوگوں سے فیض حاصل کیا‘ اُن سے پوچھا‘ غور کرتے رہے۔ اور پھر جہاں تک کہ ڈاکٹر صاحب کی تحریروں کا تعلق ہے وہ عالمانہ تحریریں ہیں اور بتلاتی ہیں کہ ان کی استعدادِ علمی جو ہے وہ پختہ ہے اور اس کی روشنی میں وہ قرآن مجید کی جو تشریح کرتے ہیں اور جو تقریریں کرتے ہیں وہ مَیں سمجھتا ہوں کہ ہمارے بعض اچھے اچھے علماء اس طرح سے نہیں کر سکتے ہیں۔ لہٰذا یہ تو بہت ہی ناقص قسم کا اعتراض ہے۔ یہ تو محض اعتراض برائے اعتراض والا معاملہ ہے۔

سوال: مولانا جزاک اللہ! آپ نے اس مسئلہ میں بڑی مفید رہنمائی عطا فرمائی ہے۔ مولانا! آپ نے شروع میں مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہ کی خط و کتابت کا حوالہ دیا تھا جو ’میثاق‘ میں شائع ہوئی ہے۔ تو ڈاکٹر صاحب نے اس کی جو وضاحت فرمائی ہے وہ بھی آپ کی نظر سے گزری ہوگی (اس موقع پر مولانا نے فرمایا: جی ہاں! وہ مَیں نے پوری پڑھی ہے۔) تو الحمدللہ مولانا اخلاق حسین قاسمی صاحب بھی اس سے مطمئن ہو گئے۔ پھر یہ کہ مولانا محمد یوسف لدھیانوی مدظلہ جو ماہنامہ ’’بینات‘‘ کراچی کے مدیر اعلیٰ ہیں انہوں نے بھی الحمد للہ اس پر اظہارِ اطمینان کیا ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ آج آپ نے جو رہنمائی فرمائی ہے‘ اس کے متعلق مَیں‘ ان شاء اللہ‘ ڈاکٹر صاحب سے عرض کروں گا کہ وہ غور فرمائیں کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے جو مسلک اختیار کیا تھا وہ ڈاکٹر صاحب جیسے شخص کے لیے بہت محفوظ اور مامون نظر آتا ہے۔ اس ضمن میں کیا آپ ڈاکٹر صاحب کے لیے کوئی مزید رہنمائی عطا فرمائیں گے؟

جواب: اگر کوئی تعلّی نہ ہو تو مَیں خود یہ عرض کر سکتا ہوں کہ خود میرا مسلک بھی یہی ہے۔ چنانچہ مَیں نے جو مضامین لکھے ہیں‘ ان میں کئی جگہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کو ترجیح دی ہے امام

ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک پر۔ تو ’’تلفیق بین المذاہب‘‘ خاص طور پر موجودہ زمانہ میں بہت ضروری ہے‘ اس کے بغیر تو ہم چل ہی نہیں سکتے۔ اس دور میں کسی خاص ایک امام کا دامن پکڑ کر چلتے رہیں اور اِدھر اُدھر نہ دیکھیں‘ دوسرے ائمہ فقہاء کی اجتہادی آرا سے استفادہ نہ کریں تو یہ بالکل ناممکن ہے۔ اگر آپ کو دنیا کے موجودہ مسائل حل کرنے ہیں تو لازمی طور پر آپ کو تلفیق بین المذاہب پر عمل کرنا ہوگا۔

جزاک اللہ‘ مولانا! مَیں آپ کا انتہائی ممنون ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحتِ کاملہ عطا فرمائے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ آپ کا جذبۂ تعاون علی البِر والتقویٰ ہے کہ اس علالت اور ضعف کے باوجود آپ نے ہمیں وقت عنایت فرمایا اور اپنے ارشاداتِ عالیہ نیز اس عاجز کے سوالات کے مفصل جوابات ریکارڈ کرائے۔ آخر مَیں آپ سے درخواست ہے کہ آپ ہمارے لیے اور ڈاکٹر صاحب کے لیے دُعا فرماتے رہیے۔ خاص طور پر ڈاکٹر صاحب آپ جیسے بزرگوں کی دُعاؤں کے بہت محتاج ہیں۔ چونکہ جب کوئی شخص دینی خدمت کے لیے کھڑا ہوتا ہے‘ دعوت دیتا ہے تو شیطان اس پر جو جال ڈالتا ہے وہ عُجب کا‘ تکبّر کا‘ اور انانیت کا ڈالتا ہے۔ دُعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ ان مہلکات سے ڈاکٹر صاحب کو محفوظ رکھے۔

راقم کی اس درخواست پر مولانا مدظلہ نے فرمایا:

’’ڈاکٹر صاحب کے لیے اور آپ لوگوں کے لیے مَیں کیا ہوں۔ مَیں تو یقین رکھتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب اور ان کے ساتھیوں کے لیے سمندر کی مچھلیاں اور آسمان کے فرشتے دعا کرتے ہیں۔ بہرحال میری دُعائیں اور نیک تمنّائیں آپ حضرات کے ساتھ ہیں۔‘‘

❁❁❁

اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر
’’بیان القرآن‘‘ کے ترجمہ و ترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں‘
آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔ (ان شاء اللہ!)

تفسیر کے ناقابلِ اعتبار مآخذ

بسلسلہ علم تفسیر اور مفسّرین کرام (۸)

پروفیسر حافظ قاسم رضوان

اسرائیلیات کے رواۃ (مسلسل)

(د) حضرت وھب بن منبہ رحمۃ اللہ علیہ

حضرت وھب بن منبہ یمنی صنعانی کی کنیت ابوعبداللہ ہے۔ یہ یمن کے علاقے صنعاء کے باشندے اور فارسی الاصل تھے۔ ان کے والد اہلِ ہرات میں سے تھے۔ کسریٰ ایران نے ان کے والد منبہ کو یمن کی جانب بھیج دیا تھا اور وہ عہدِ رسالت میں مسلمان ہو چکے تھے۔ وہب نے ہرات کے سفر بھی کیے تھے' بعض علماء کے مطابق آپ صنعاء کے قاضی بھی مقرر ہوئے۔ اسحٰق بن ابراہیم بن عبدالرحمٰن حضروی کا کہنا ہے کہ وھب ۳۴ھ میں خلافتِ عثمانی کے عہد میں پیدا ہوئے اور بقول ابنِ سعد' صاحبِ طبقات آپ کی وفات ۱۱۰ھ میں ہوئی۔ وھب عابد و زاہد تابعی تھے' انہوں نے حضرات ابوہریرہ' ابوسعید خدری' عبداللہ بن عمر' ابن عباس' جابر' عبداللہ بن عمرو بن العاص اور انس (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) سے کسبِ فیض کیا اور روایتیں لی ہیں۔ حضرت وھب سے روایت کرنے والوں میں ان کے دونوں بیٹے عبداللہ و عبدالرحمٰن اور عمرو بن دینار وغیرہ شامل ہیں۔ وھب بن منبہ کے پاس علماء اہلِ کتاب کی روایات اور کتابوں کا وسیع علم تھا' یہاں تک کہ اس معاملے میں وہ اپنے آپ کو حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور حضرت کعب الاحبار کے علوم کا جامع سمجھتے تھے۔ ابنِ سعد نے لکھا ہے کہ وھب نے ان روایات پر مشتمل ایک کتاب 'احادیث الانبیاء' کے نام سے تالیف کی تھی۔ آپ قصص و واقعات اور آغازِ کائنات کے متعلق بھی بہت کچھ جانتے تھے۔ مروّج الذہبی کے مطابق انہوں نے ایک کتاب 'المبدأ' کے نام سے لکھی تھی۔ حاجی خلیفہ نے 'کشف الظنون' میں شاید اسی کو 'کتاب

الاسرائیلیات' کے نام سے ذکر کیا ہے۔ اسی طرح یاقوت الحموی اور قاضی ابن خلکان نے وھب کی ایک اور کتاب کا 'ذکر الملوک المفتوحة من حمیر و اخبارھم وغیرذٰلک' کے نام سے تذکرہ کیا ہے۔ ابن خلکان نے ایک جلد پر مشتمل یہ کتاب خود دیکھی تھی۔ وھب بن منبہ سے منقول ہے کہ انہوں نے مغازی سے متعلق بھی ایک کتاب تحریر کی تھی۔

حضرت وھب بن منبہ کا علمی مرتبہ

امام احمد بن حنبل' عبدالرزاق سے اور وہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ ۱۰۰ھ میں بکثرت فقہاء فریضۂ حج کی ادائیگی کے لیے گئے۔ ایک رات عشاء کی نماز سے فراغت کے بعد وھب کے پاس کچھ لوگ آئے جن میں عطاء اور حسن بصری جیسے اشخاص بھی شامل تھے۔ دراصل وہ تقدیر کے مسئلے میں وھب بن منبہ سے گفتگو کرنا چاہتے تھے۔ وھب طلوعِ فجر تک بات چیت کرتے رہے' چنانچہ یہ لوگ رخصت ہو گئے اور ان سے مزید کچھ بھی دریافت نہیں کیا۔ امام احمد کا بیان ہے کہ وھب منکرِ تقدیر تھے مگر بعد ازاں اس سے رجوع کر لیا۔ حماد بن سلمہ' ابوسنان سے نقل کرتے ہیں کہ مَیں نے وھب کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ مَیں تقدیر کا انکار کیا کرتا تھا' حتیٰ کہ مَیں نے انبیاء پر نازل شدہ ستّر سے زائد کتابیں مطالعہ کیں' پھر مَیں نے اس نظریے سے رجوع کر لیا۔ یہ واقعات اس حقیقت کی آئینہ داری کرتے ہیں کہ وھب قدیم آسمانی کتب میں گہری بصیرت و مہارت رکھتے تھے' نیز انہوں نے انکارِ تقدیر کے عقیدہ سے رجوع کر لیا تھا۔ اب ظاہر ہے کہ اس نظریے کو ترک کر دینے کے بعد وھب کو انکارِ تقدیر کا مجرم قرار دینا بالکل درست نہیں۔ مثنیٰ بن صباح کا بیان ہے کہ وھب نے بیس سال تک عشاء کے وضو کے ساتھ نمازِ فجر ادا کی۔ آپ کے صدق و امانت پر محدثین اور ائمہ جرح و تعدیل نے کوئی کلام نہیں کیا۔ حافظ ابن حجر تحریر کرتے ہیں کہ وھب تابعی کو جمہور نے ثقہ قرار دیا ہے۔ محدث العجلی کا کہنا ہے کہ وھب بڑے ثقہ تابعی اور صنعاء کے قاضی تھے۔ حافظ ذہبی کا بیان ہے کہ وھب نہایت ثقہ اور صادق تھے' اور اسرائیلی کتابوں سے بکثرت نقل کرتے تھے۔ ابوزرعہ' امام نسائی اور ابن حبان نے بھی وھب کی تعدیل کی ہے۔ امام بخاری اور امام مسلم دونوں نے اپنی اپنی صحیح میں ان کی روایات ذکر کی ہیں۔ وھب کے بھائی ہمام بن منبہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک مشہورِ زمانہ صحیفہ روایت کیا ہے' جس کا اکثر حصّہ صحاحِ ستّہ میں موجود ہے' یہ صحیفہ معمر نے ھمام سے روایت کیا۔

وھب بن منبہ نے جو روایات آنحضرت ﷺ کی طرف منسوب کی ہیں' اگر ان کی سند اصولِ حدیث کی شرائط پر پوری اُترتی ہو تو ان کو بلاشک وشبہ قبول کیا جائے گا' البتہ زمانہ ماضی کے جو قصے اور مستقبل کی جو خبریں انہوں نے بغیر کسی حوالے کے بیان کی ہیں' وہ زیادہ تر اسرائیلی روایات ہیں جن کے بارے میں ہمیں یہ حکم ہے کہ نہ تو ان کی تصدیق کریں اور نہ ہی تکذیب۔ دراصل اسرائیلی روایات کا محض بیان کرنا کوئی جرم نہیں جس کی بنا پر کسی کو ضعیف قرار دیا جائے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان روایات پر کسی اسلامی عقیدے یا حکم کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔ بعض لوگوں نے وھب کو تنقید کا نشانہ بھی بنایا ہے۔ اگرچہ وھب نے بکثرت اسرائیلی قصص اور اخبار روایت کیے ہیں' لیکن اس حوالے سے انہوں نے دروغ گوئی سے کام نہیں لیا اور نہ ہی اسلامی عقائد واحکام کے بگاڑنے سے ان کا کوئی واسطہ ہے۔ قصور وار تو دراصل متاخرین میں سے وہ لوگ ہیں جنہوں نے ان واقعات وحکایات کو کُتبِ تفسیر میں داخل کیا' بلکہ بہت سے مَن گھڑت واقعات اور باتیں بھی ان میں شامل کر دیں۔

(۹) حضرت ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ

آپ عبدالملک بن عبدالعزیز بن جریج القریش المکی ہیں' کنیت ابوالولید یا ابوخالد ہے۔ آپ تبع تابعین میں سے ہیں اور مکّہ کے محدّثین اور علماء میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ آپ نے حضرات طاؤس' عطاء بن ابی رباح' مجاہد' ابن ابی ملیکہ اور نافع سے تحصیل علم کی۔ علاوہ ازیں ابن جریج نے اپنے والد' زید بن اسلم' امام زہری وغیرہ سے بھی اپنی علمی پیاس بجھائی۔ خود ابن جریج سے ان کے دونوں بیٹوں عبدالعزیز ومحمد نیز امام اوزاعی' لیث' یحییٰ بن سعید انصاری' حماد بن زید اور دیگر اہلِ علم نے استفادہ کیا۔ طبقات ابنِ سعد کے مطابق آپ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور مختلف روایات کے حوالے سے آپ نے ۱۵۰ھ یا ۱۵۶ھ میں اس دنیائے فانی سے کوچ کیا۔ عبادت وزہد میں بھی ابن جریج بلند پایہ بزرگ تھے' مہینے میں صرف تین دن روزے کے بغیر رہتے تھے' ورنہ سارا مہینہ روزے رکھتے تھے (تھذیب التھذیب)۔ امام عبدالرزاق کا بیان ہے کہ جب کبھی مَیں ابن جریج کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھتا تو مجھے یقین ہو جاتا کہ آپ کا دل خشیت اللہ سے معمور ہے۔ ابن جریج نے تحصیل علم کے لیے کئی سفر کیے۔ آپ مکہ میں پیدا ہوئے اور تلاشِ علم میں بصرہ' یمن اور بغداد وغیرہ کی خاک بھی چھانی۔

حضرت ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ کا علمی مرتبہ

ابن خلدون اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ ابن جریج نے ادھیڑ عمر میں علم حاصل کیا' اگر آپ بچپن میں تحصیلِ علم کرتے تو بہت سے صحابہؓ سے کسبِ فیض کے مواقع میسّر آتے۔ ابن جریج کا اپنا بیان ہے کہ مَیں عربی اشعار اور علم الانساب کی تحصیل میں لگا رہتا تھا' مجھ سے کہا گیا کہ کاش! آپ عطاء بن ابی رباح کے دامن سے وابستہ ہو جائیں' چنانچہ مَیں نے اٹھارہ سال عطاء کی صحبت ورفاقت میں گزار دیے۔ یہی وجہ ہے کہ جب عطاء سے سوال ہوا کہ آپ کے بعد ہم کس سے مسائل پوچھا کریں؟ تو عطاء نے ابن جریج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر یہ نوجوان زندہ رہے تو اس سے۔ اسی لیے حضرت عطاء بن ابی رباح کی روایات کے معاملے میں آپؒ کو 'اثبت النّاس' (تمام لوگوں میں سب سے زیادہ قابلِ اعتماد) کہا گیا ہے۔ ابن جریج کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ آپ ارضِ حجاز کے اولین مصنف تھے۔ آپ کا شمار امام مالک کے طبقہ میں ہوتا ہے جنہوں نے جمع وتدوینِ حدیث کا بیڑا اٹھایا اور علوم کی پہلی بار تدوین کی۔ عبدالرزاق بن ہمام کے مطابق خود آپ کا کہنا ہے: ما دوّن العلم تدوینی احد (مجھ سے پہلے کسی نے بھی میری طرح علم کی تدوین نہیں کی)۔ امام احمد بن حنبلؒ کے بیٹے عبداللہ کا کہنا ہے کہ مَیں نے اپنے والد سے عرض کیا کہ سب سے پہلے کس نے کتاب تصنیف کی؟ آپ نے فرمایا کہ ابن جریج اور ابن ابی عَروبہ نے۔ بیشتر محدّثین نے ابن جریج کو ثقہ قرار دیا ہے' صحاحِ ستّہ میں آپ کی روایات بکثرت مروی ہیں۔ (تھذیب التھذیب)

سلیمان بن نضر کا قول ہے کہ مَیں نے ابن جریج سے بڑھ کر سچ بولنے والا نہیں دیکھا۔ محدث ابن معین کے بیان کے مطابق ابن جریج اپنی کتاب سے جو روایات بیان کرتے ہیں وہ صحیح ہوتی ہیں۔ یحییٰ بن سعید کا کہنا ہے کہ ہم ابن جریج کی تصانیف کو 'کُتبِ امانت' کہا کرتے تھے اور اگر وہ اپنی اس کتاب سے حدیث بیان نہ کرتے تو اس سے استفادہ نہیں کیا جاتا تھا۔ ابن حبان کی رائے ہے کہ ابن جریج ثقہ تھے اور حجاز کے قُرّاء اور ثقات میں شامل تھے۔ البتہ بعض علماء نے آپ پر جرح بھی کی ہے۔ امام مالکؒ کا کہنا ہے کہ ابن جریج اس بات کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے کہ وہ کس (ثقہ یا غیر ثقہ) سے حدیث روایت کر رہے ہیں۔ آپ ابن جریج کو 'حاطب اللیل' کہتے تھے جو کہ اندھیرے میں خشک وتر ہر قسم کی لکڑیاں جمع کر لیتا ہے۔ اس

کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آپ بعض اوقات ضعیف راویوں سے تدلیس کر جاتے تھے۔ اسی بنا پر محقّقین کا فیصلہ ہے کہ جو روایات ابن جریج نے صراحتاً حَدَّثَنِی یا اَخْبَرَنِی کے الفاظ سے نقل کی ہیں‘ وہ تو صحیح ہیں اور جو روایات عَن کے لفظ سے نقل کی ہیں‘ وہ مشتبہ ہیں۔ ابن جریج اپنے عہد میں اسرائیلیات کے محور میں شامل تھے۔ جو آیاتِ قرآنی سابقہ اُمتوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں اور تفسیر ابن جریر میں ان کی جو تشریح وتوضیح بیان ہوئی ہے‘ اس کا دارومدار ابن جریج کی روایات پر ہی ہے۔ انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی بکثرت تفسیری روایات نقل کی ہیں‘ ان میں صحیح وسقیم ہر نوع کی روایات شامل ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ابن جریج نے ان میں اور دیگر مرویات میں بھی صحت کا پورا التزام نہیں رکھا‘ ہر آیت کی تفسیر میں وارد شدہ اقوال وآثار کو بلا امتیاز اور بغیر جانچے یکجا کر دیا ہے۔ ان سے استفادہ کرنے والے مفسّر پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ ابن جریج سے منقول تفسیری روایات واقوال کو تنقیدی نگاہ سے دیکھے اور غیر مستند ضعیف وسقیم روایات کو قطعاً قبول اور نقل نہ کرے۔

اسرائیلیات کے بارے میں علامہ ابن خلدونؒ کی رائے

اس میں شک نہیں کہ تفسیر منقول کے بارے میں متقدمین نے بڑا مواد فراہم کیا‘ مگر صد حیف کہ ان کی تصانیف رطب ویابس اور مقبول ومردود سبھی قسم کی روایات پر مشتمل ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہلِ عرب پڑھے لکھے نہ تھے‘ بلکہ ان پر جہالت وبداوت کا غلبہ تھا۔ انسانی فطرت ہمیشہ سے تکوینی اسباب اور آغازِ تخلیق سے متعلق اُمور کی ٹوہ میں لگی رہی ہے‘ چنانچہ عربوں نے جب بھی ایسی کوئی بات پوچھنی ہوتی تو وہ اپنے معاصر یہود ونصاریٰ سے دریافت کرتے۔ دوسری طرف اہلِ کتاب بھی اس ضمن میں تقریباً عربوں ہی کی طرح اَن پڑھ تھے اور صرف انہی باتوں سے آگاہ تھے جو اہلِ کتاب میں زبانِ زدِ عام تھیں۔ اکثر یہود قبیلہ حِمیر سے تعلق رکھتے تھے مگر انہوں نے یہودی مذہب اختیار کر لیا تھا۔ یہ لوگ حلقہ بگوشِ اسلام ہونے کے بعد بھی بدستور ان امور کے معتقد رہے جن کا شرعی احکام سے کچھ تعلق نہیں تھا‘ مثلاً یہ کہ تخلیق بنی نوعِ انسان کا آغاز کب ہوا؟ فلاں فلاں واقعات وحوادث اور جنگیں کب اور کیسے رونما ہوئیں؟ اور اس قسم کے دیگر امور وغیرہ۔ ایسے واقعات کے راوی زیادہ تر کعب الاحبار‘ وھب بن منبہ اور عبداللہ بن سلام جیسے لوگ ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی نقل کردہ روایات سے کتبِ تفسیر بھر گئیں۔ ان

میں سے کچھ ایسی روایات بھی تھیں جو مرفوع نہیں بلکہ محض ان اشخاص کے اقوال ہیں جن کا شرعی احکام سے کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ مفسّرین نے اس ضمن میں سہل انگاری سے کام لیا اور ان کی مرتب کردہ کتبِ تفسیر ایسے اقوال کا پلندہ بن گئیں‘ حالانکہ یہ اقوال بلا تحقیق نقل کر دیے گئے تھے اور ان کو شہرت محض اس لیے حاصل ہو گئی تھی کہ ان کے قائلین کو مذہبی تقدس حاصل تھا‘ جس کی بنا پر ان کی جانب منسوب اقوال بلا شک وشبہ تسلیم کر لیے جاتے تھے۔ (مقدمہ ابن خلدون)

مسلم دنیا میں فلسفۂ تاریخ کے بانی ابن خلدون کا مذکورہ بالا بیان اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ ان کی رائے میں تفسیری اقوال میں اسرائیلی روایات کی اشاعت دو امور کی مرہونِ منت ہے۔ پہلی وجہ تو عربوں پر جہالت وبداوت کا غلبہ اور اسبابِ تکوین واسرارِ وجود کا بڑھا ہوا شوق ہے‘ جو ہر انسان کی فطرت میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ عربوں کو یہ سب باتیں اہلِ کتاب سے یا جو ان میں سے مسلمان ہو گئے تھے‘ انہی سے دریافت کرنا ہوتی تھیں۔ دوسری وجہ یہ بنتی ہے کہ چونکہ ان امور‘ معاملات اور قصص کا دینی وشرعی احکام سے کچھ تعلق نہیں تھا‘ اس لیے یہ مرویات اور اقوال بلا جرح ونقد تسلیم کر لیے گئے۔ اس مسئلے کو یوں سمجھیں کہ قرآن پاک میں تخلیقِ کائنات اور پچھلی اُمتوں کے واقعات مختصراً بیان ہوئے ہیں اور صرف انہی پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے جو کہ سبق آموز ہیں۔ اس کے برعکس سابقہ کتبِ سماوی‘ متعلقہ تشریحی کتب اور دیگر صحائف میں ان تمام باتوں کا تفصیل سے احاطہ کیا گیا ہے۔ انسانی فطرت متجسّس واقع ہوئی ہے‘ اس لیے واقعات اور قصص کی درمیانی اور تفصیلی کڑیاں ملانے کے لیے ذوق وشوق سے اہلِ کتاب سے تفصیلات لی گئیں اور اس میں صحت‘ سند اور تفکّر وتدبّر کسی چیز کا بھی دھیان نہ رکھا جا سکا۔ مزید بدقسمتی یہ ہوئی کہ بعض لوگوں نے بالکل مَن گھڑت واقعات بھی اعتماد پیدا کرنے کے لیے صحیح راویوں کی طرف منسوب کر دیے اور یہ تمام افکار وآراء اسی طرح سہل نگاری سے کتبِ تفسیر میں بھی جگہ پا کر اپنے بعد والوں کے لیے گویا تقدیس اور سند کا درجہ حاصل کر گئے۔

مفسّرِ قرآن کا اسرائیلیات کے بارے میں رویّہ

یہ امر بالکل پوشیدہ نہیں کہ صحیح وسقیم میں امتیاز کے بغیر اہلِ کتاب سے نقل وروایت دین کے حوالے سے ایک عظیم فتنہ سے کم نہیں۔ اس ضمن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد ’’اہلِ کتاب کی نہ تصدیق کریں نہ تکذیب‘‘ ایک بنیادی ضابطہ ہے جس سے انحراف کسی طور سے بھی ممکن

نہیں۔اس تناظر میں ایک مفسر کو درج ذیل فرائض مدِّنظر رکھنے چاہئیں:

(۱) اس پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ حد درجے مستعدی اور بیدار مغزی سے کام لے اور اسرائیلیات کے پلندے سے وہ مواد چھانٹ لے جو روحِ قرآن سے لگّا کھاتا اور عقل و نقل کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔

(۲) اسی طرح مفسر کے فرائض میں یہ امر بھی شامل ہے کہ جب قرآن کی کسی مجمل آیت کی تفسیر حدیث نبویؐ میں موجود ہو تو اس صورت میں اسرائیلی روایات سے بالکل اخذ و استفادہ نہ کرے۔ جیسے کہ قرآن میں سورۂ صٓ کی آیت: ﴿وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ وَاَلْقَيْنَا عَلٰى كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا﴾ (آیت ۳۴) ''اور ہم نے سلیمان کو آزمایا اور ان کے تخت پر ایک جسم ڈال دیا'' کی تشریح صحیح بخاری میں موجود ہے' اس کو نظر انداز کر کے یہ واقعہ دوسرے مَن گھڑت واقعات اور روایات پر محمول نہیں کرنا چاہیے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ایک مرتبہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا: مَیں آج اپنی ایک سو بیویوں سے مجامعت کروں گا اور ان میں سے ہر کوئی ایک مجاہد بچہ جنے گی۔ آپؑ کے ساتھی نے کہا کہ 'ان شاء اللہ' کہہ لیجیے مگر آپ کی توجہ نہ ہوئی۔ چنانچہ ان میں سے صرف ایک بیوی حاملہ ہوئی اور جو بچہ اس نے جنا وہ بھی ادھورا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی جان ہے' اگر سلیمان ان شاء اللہ کہہ لیتے تو (تمام بیویوں سے) مجاہد بچے جنم لیتے' جو سوار ہو کر اللہ کی راہ میں جہاد کرتے۔''

(۳) ایک مفسّرِ قرآن کا یہ بھی فرض ہے کہ متعلقہ واقعہ کو بقدر ضرورت و حاجت ہی بیان کرے۔ کسی آیت کی تشریح و توضیح کرتے وقت صرف اتنا ہی واقعہ بیان کرے جس سے قرآن کے اجمال کی تفصیل ہو سکے' اس سے زیادہ کی بالکل ضرورت نہیں۔

(۴) البتہ اگر کوئی بات متقدمین کے ہاں متنازع فیہ ہو اور اس بارے میں ان کے متعدد اقوال ہوں' تو ایک مفسّر کو جملہ اقوال ذکر کر کے صحیح قول کی نشان دہی کرنے میں قطعاً کوئی مضائقہ نہیں۔ مگر یہ بات کسی طور سے بھی مناسب نہیں کہ اختلاف کا ذکر کر کے اسے یونہی چھوڑ دیا جائے' قاری کے سامنے اقوالِ صحیحہ و سقیمہ کا انبار لگا کے اسے ورطۂ حیرت

میں ڈبو دیا جائے اور مفسر یہ واضح ہی نہ کرے کہ صحیح تر قول کون سا ہے؟

(۵) ایک مفسّر کے لیے بہتر طریقۂ کار یہی ہے کہ وہ امکانی حد تک غیر ضروری اسرائیلیات سے صَرفِ نظر کرے اور ایسے بے کار اسرائیلی روایات اور افسانے بیان کرنے سے بالکل اجتناب کرے جو قرآن پاک کا معنی و مفہوم سمجھنے میں رکاوٹ اور سنگ راہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس کی دلیل میں سورۃ الکہف کی آیت ۲۲ پیش کی جا سکتی ہے' فرمانِ الٰہی ہے:

﴿سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًۢا بِالْغَيْبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ۭ قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ ۬ فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا ۠ وَّلَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا ﴿۲۲﴾﴾

''بعض (اہلِ کتاب) کہتے ہیں کہ وہ (اصحابِ کہف) تین تھے' چوتھا ان کا کُتّا تھا' بعض کہتے ہیں کہ وہ پانچ تھے' چھٹا ان کا کُتّا تھا' یہ لوگ بلا ثبوت اٹکل پچو ہانک رہے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ سات تھے' آٹھواں ان کا کُتّا تھا۔ (اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم!) آپ کہہ دیں کہ میرا ربّ ہی ان کی گنتی کو خوب جانتا ہے' بہت کم لوگ اس سے واقف ہیں۔ آپ اس بارے میں ان سے زیادہ بحث و مباحثہ نہ کریں اور نہ ہی اس بارے میں ان میں سے کسی سے سوال کریں۔''

اس آیتِ قرآنی میں اللہ تعالیٰ نے یہ سبق سکھایا ہے کہ اس طرح کی غیر ضروری گفتگو اور بحث سے بچنا لازم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اصحابِ کہف کی تعداد کے بارے میں تین اقوال ذکر کیے' جن میں سے پہلے دو کی تضعیف کی اور تیسرے پر سکوت اختیار کیا جو اس کی صحت پر دلالت کرتا ہے۔ اس لیے کہ اگر تیسرا قول بھی صحیح نہ ہوتا تو پہلے دو کی طرح اس کی بھی تردید کی جاتی۔ پھر بتایا گیا کہ اصحابِ کہف کی متعین تعداد معلوم کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا اور نہ ہی کوئی دین و دنیا کا فائدہ اس میں مضمر ہے۔ ان کی صحیح تعداد خدائے بزرگ و برتر ہی جانتا ہے یا پھر چند گنے چنے لوگ جنہیں اصحابِ کہف کی درست تعداد سے آگاہ کیا گیا۔ ایسی ذہنی آوارگی اور بے مقصد باتوں میں اپنے آپ کو الجھانے اور دماغی طور پر تھکانے سے کچھ فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔

قرونِ اولیٰ کے ضعیف اور مختلف فیہ مفسرین

اب تابعین اور تبع تابعین کے عہد کے بعض ان مفسّرین کا مختلف تعارف پیش کیا جا رہا

ہے' جنہیں یا تو ضعیف قرار دیا گیا ہے اور یا جن کے قابلِ اعتماد ہونے میں قابلِ لحاظ اختلاف رہا ہے۔ (علوم القرآن' از مفتی محمد تقی عثمانی)

(۱) سُدّی کبیر: کتبِ تفاسیر میں 'سُدّی' کے نام سے دو صاحب معروف ہیں' دونوں کا الگ الگ تذکرہ کیا جا رہا ہے۔ پہلے اسماعیل بن عبدالرحمٰن بن ابی کریمہ السدّی الکوفی ہیں' کنیت ابومحمد اور 'السدّی الکبیر' کے نام سے معروف ہیں۔ تفسیر کی کتابوں میں جب صرف 'سُدّی' لکھا جاتا ہے تو عموماً یہی مراد ہوتے ہیں۔ ان کو سُدّی کہنے کی وجہ یہ ہے کہ کوفہ کی جامع مسجد کے دروازے پر ایک چبوترہ سا تھا جس پر بیٹھ کر یہ اوڑھنیوں کی تجارت کیا کرتے تھے۔ دروازے کے ایسے چبوترے کو عربی میں 'سُدّہ' کہتے ہیں' اسی لیے ان کو سُدّی کہا جانے لگا۔ ان کو تفسیر قرآن کی درس و تدریس کا خاصا ذوق وشوق تھا' چنانچہ تفسیر کی کتابیں ان کے اقوال اور روایات سے بھری ہوئی ہیں۔ البتہ علمِ تفسیر اور روایات کے معاملے میں یہ کس حد تک قابلِ اعتماد ہیں' اس مسئلے میں محققین کی آراء مختلف ہیں۔ بعض حضرات نے ان کی توثیق کی ہے' مثلاً حضرت یحییٰ بن سعید القطان کا کہنا ہے کہ ان کی روایات میں کوئی حرج نہیں' مَیں نے جس کسی کو ان کا ذکر کرتے ہوئے سنا' ذکرِ خیر کرتے سنا۔ امام احمد کا قول ہے کہ وہ ثقہ ہیں۔ امام ابن عدی کا بیان ہے کہ میری نظر میں حدیث کے معاملے میں وہ ٹھیک ہیں' سچے ہیں' ان میں کوئی حرج نہیں۔ العجلی کے مطابق سُدّی کبیر تفسیر کے ثقہ عالم اور راوی ہیں۔ امام نسائی انہیں صالح کہتے ہیں۔ امام بخاری نے اپنی تاریخ کبیر میں ان کے بارے میں کوئی جرح نقل نہیں فرمائی اور نہ ہی خود کی ہے' بلکہ اسماعیل بن ابی خالد کا یہ قول نقل کیا ہے کہ سُدّی قرآن کریم کے شعبی سے زیادہ بڑے عالم ہیں۔ امام مسلم کے نزدیک بھی یہ ثقہ ہیں' کیونکہ انہوں نے اپنی صحیح میں ان سے حدیث لی ہے۔

اس کے برعکس بہت سے دوسرے علماء نے سُدّی الکبیر پر جرح بھی کی ہے' مثلاً حضرت یحییٰ بن معین انہیں ضعیف قرار دیتے ہیں' ان کا کہنا ہے کہ ان کی احادیث میں ضعف ہے۔ ابوحاتم کا بیان ہے کہ ان کی احادیث لکھ لی جائیں مگر ان سے استدلال درست نہیں۔ امام شعبی سے کسی نے کہا کہ سُدّی کو قرآن حکیم کے علم کا بڑا حصّہ ملا ہے' اس کے جواب میں امام شعبی نے فرمایا کہ ان کو قرآن کریم سے جاہل ہونے کا بڑا حصّہ ملا ہے۔ ابوزرعہ انہیں لیّن (نرم) کہتے ہیں' جو کہ بالکل ادنیٰ درجے کی توثیق ہے۔ ساجی کا سُدّی کے بارے میں کہنا ہے کہ سچے ہیں مگر

محلِ نظر ہیں۔ امام طبری کا قول ہے کہ ان کی احادیث سے استدلال درست نہیں۔ امام عقیلی کا بیان ہے کہ ضعیف ہیں اور شیخین (حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما) کی بدگوئی کرتے تھے۔ حسین المروزی تحریر کرتے ہیں کہ مَیں نے سُدّی سے احادیث سنی ہیں اور ان کو اس وقت چھوڑا جب مَیں نے ان کو سنا کہ وہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے خلاف بدزبانی کر رہے ہیں' اس کے بعد مَیں ان کے پاس نہیں گیا۔

حافظ ابن حجر نے سُدّی الکبیر کے بارے میں ساری بحث کا خلاصہ یہ نکالا ہے: ''صَدوق یھم ورمی بالتشیّع'' (وہ سچے ہیں مگر ان کو روایت میں وہم ہو جاتا ہے اور ان پر تشیّع کا الزام بھی ہے)۔ لفظ 'صدوق' محدثین کی اصطلاح میں اس شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے جو جھوٹا تو نہ ہو لیکن اس کا حافظہ بھی معیاری نہ ہو۔ لہٰذا سُدّی کی صحیح حیثیت یہ ہے کہ قوتِ حافظہ کے اعتبار سے یہ محدثین کے معیار پر پورا نہیں اترتے' دوسرے ان پر شیعہ ہونے کا بھی الزام ہے۔ لیکن سُدّی کو تبرا باز (شتّام) کے ساتھ کذاب صرف امام جوزجانی نے کہا ہے۔ آپ نے ۱۲۷ھ میں اس دنیائے فانی سے کوچ کیا۔

(۲) سُدّی صغیر: دوسرے صاحب جو سُدّی کے نام سے معروف ہیں' وہ محمد بن مروان السُدّی ہیں' جو عبدالرحمٰن بن زیدؓ بن خطاب کے آزاد کردہ غلام تھے۔ ان کی تفسیری روایات سُدّی کبیر کے مقابلے میں کم ہیں اور ان کو سُدّی کبیر سے ممتاز کرنے کے لیے 'السُدّی الصغیر' کہا جاتا ہے۔ یہ بھی کوفہ کے باشندے ہیں اور ان کے ضعیف ہونے پر تمام محدثین کا اتفاق ہے۔ سُدّی صغیر مشہور مؤرخ کلبی کے شاگرد ہیں۔ امام بخاری کا فرمان ہے کہ ان کی احادیث ہرگز نہ لکھی جائیں۔ ابن معین کا کہنا ہے کہ وہ ثقہ نہیں۔ حافظ ذہبی کا سُدّی صغیر کے بارے میں قول ہے کہ محدثین نے انہیں چھوڑ دیا ہے اور بعض لوگوں نے ان پر جھوٹ کا الزام بھی لگایا ہے۔ ایک دوسری جگہ ذہبی ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ انتہائی واہیات راوی ہیں۔ امام احمد کا کہنا ہے کہ مَیں نے ان کو اس وقت پایا جب وہ بوڑھے ہو چکے تھے' لہٰذا مَیں نے ان کو چھوڑ دیا۔ امام نسائی کے مطابق ان کی احادیث ترک کر دی جائیں گی۔ ابوعلی صالح بن محمد کے بقول (سُدّی صغیر) ضعیف تھے اور احادیث گھڑا بھی کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے تذکرے میں یہ بات سامنے آ چکی ہے کہ 'تنویر المقیاس فی تفسیر ابن عباسؓ' (المعروف

تفسیر ابن عباسؓ) کا مروجہ نسخہ انہی سُدّی الصغیر سے مروی ہے اور علامہ سیوطی و دیگر محدثین نے اس کی سند کو 'سلسلة الكذب' (جھوٹ کا سلسلہ) قرار دیا ہے' اس لیے اس کا کوئی اعتماد اور اعتبار نہیں۔ ان کی وفات کے حوالے سے ۱۸۱ھ سے لے کر ۱۹۰ھ تک مختلف اقوال ملتے ہیں۔

(۳) مقاتل بن سلیمان: مقاتل نام کے بھی دو صاحب مشہور ہیں۔ ایک ابو بسطام مقاتل بن حیان اور دوسرے ابوالحسن مقاتل بن سلیمان۔ دونوں ایک ہی شہر یعنی بلخ کے رہائشی ہیں' دونوں کا زمانہ بھی ایک ہے' دونوں روایت بھی ایک ہی طرح کے اساتذہ سے کرتے ہیں اور دونوں کا سال وفات بھی ایک ہے' اسی لیے بسا اوقات ان دونوں میں التباس ہو جاتا ہے۔ ان میں سے مقاتل بن حیان راجح قول کی بنا پر ثقہ ہیں اور جلیل القدر علماء میں سے ہیں' لیکن کتبِ تفسیر میں ان کا حوالہ کم آتا ہے۔ عموماً تفاسیر میں جب صرف مقاتل لکھا جاتا ہے تو اس سے مراد مقاتل بن سلیمان ہوتے ہیں' کیونکہ یہی مفسّر کے لقب سے مشہور ہیں اور انہی کی روایات اور اقوال کُتبِ تفسیر میں زیادہ ہیں' اس لیے انہی کا حال کچھ تفصیل سے پیشِ خدمت ہے۔

مقاتل بن سلیمان نے بذاتِ خود ایک تفسیر لکھی تھی (یہ غالباً تفسیر کی اوّلین کتاب ہے جو کہ ہم تک محفوظ پہنچی ہے)' جس کے حوالے کُتبِ تفسیر میں بھی بکثرت آتے ہیں۔ چند علماء نے ان کی تعریف کی ہے لیکن اکثر علماء اور محدثین نے انہیں مجروح اور نا قابل اعتبار بتایا ہے۔ امام شافعیؒ کا کہنا ہے کہ لوگ تفسیر کے معاملے میں مقاتل کے محتاج ہیں۔ حضرت بقیّہ کا قول ہے: حضرت شعبہ سے مقاتل کے بارے میں بکثرت سوال کیا جاتا تھا' مَیں نے ان کو مقاتل کا ذکر خیر کرتے ہوئے ہی پایا۔ مقاتل بن سلیمان کو مقاتل بن حیان علم کا سمندر کہا کرتے تھے' لیکن بیشتر ائمہ حدیث نے ان پر شدید جرح اور تنقید کی ہے۔ مقاتل پر پہلا اعتراض تو یہ ہے کہ وہ بے اصل' وضعی روایات نقل کرتے ہیں۔ جیسے وکیع کا کہنا ہے کہ ہمارا ارادہ ہوا کہ ہم سفر کر کے مقاتل کے پاس جائیں لیکن وہ خود ہی ہمارے شہر آ گئے' ہم ان کے پاس پہنچے مگر ہم نے انہیں کذاب پایا' اس لیے ان سے کچھ نہیں لکھا۔ جوزجانی کا ان کے بارے میں قول ہے کہ بڑا ڈھیٹ کذاب ہے۔ ابن معین کے بقول وہ ثقہ نہیں۔ ایک دوسرے موقع پر انہوں نے مقاتل کے بارے میں کہا کہ وہ کچھ بھی نہیں۔

ابن سعد رقم طراز ہیں کہ علمائے حدیث اس کی حدیث سے بچتے اور اسے منکر سمجھتے ہیں۔

عبدالرحمٰن بن حکم کے بقول وہ (مقاتل) قصّہ گو تھا' لوگوں نے اس کی احادیث ترک کر دی ہیں۔ امام نسائی کا ارشاد ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف جھوٹی احادیث گھڑ کر منسوب کرنے والے چار آدمی بہت مشہور ہیں' ان میں سے ایک مقاتل بھی ہے۔ امام دارقطنی ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ امام حاکم کے مطابق وہ علماء کے نزدیک قوی نہیں ہیں۔ عبدالصمد بن عبدالوارث بیان کرتے ہیں کہ مقاتل ہمارے پاس آئے اور ہمیں عطاء کے واسطے سے کچھ حدیثیں سنانے لگے' پھر وہی حدیثیں ضحاک کے واسطے سے سنائیں اور پھر وہی احادیث عمرو بن شعیب کے واسطے سے سنائیں۔ ہم نے ان سے پوچھا کہ یہ روایات آپ نے کس سے سنی ہیں؟ تو پہلے تو انہوں نے کہا کہ ان سب سے سنی ہیں' مگر پھر کہنے لگے کہ نہیں' خدا کی قسم! مجھے یاد نہیں کہ یہ کس سے سنی ہیں۔ امام بخاری کا فرمان ہے کہ وہ ہرگز کوئی شے نہیں۔ عبداللہ بن مبارک' مقاتل کی عبادت گزاری کی تعریف کرتے تھے لیکن ان کی روایات قبول کرنے سے اجتناب برتتے۔

مقاتل پر دوسرا بڑا اعتراض یہ ہے کہ یہ عقائد کے اعتبار سے فرقۂ مجسمہ سے تعلق رکھتے تھے (یعنی اللہ تعالیٰ کی صفات کو مخلوق کی صفات کے مشابہ قرار دیتے اور اللہ تعالیٰ کے لیے مختلف اعضاء وغیرہ کے قائل تھے)۔ عباس بن مصعب مروزی کہتے ہیں کہ مقاتل بن سلیمان اصلاً بلخ کے باشندے تھے' پھر مرو میں آ گئے' یہاں انہوں نے جامع مسجد میں قصہ گوئی شروع کر دی۔ یہیں پر ان کے اور جہم بن صفوان (بانی فرقۂ جہمیہ) کے درمیان مباحثے شروع ہو گئے' چنانچہ انہوں نے ایک دوسرے کے خلاف کتابیں لکھیں۔ امام ابوحنیفہؒ کا قول ہے کہ ہمارے ہاں مشرق کی جانب سے دو بڑے خبیث نظریات گھس آئے ہیں: ایک جہم (کا نظریہ) جو معطلہ میں سے تھا اور ایک مقاتل (کا نظریہ) جو مشبّہ میں سے تھا۔ نیز امام ابوحنیفہؒ کا بیان ہے کہ جہم نے نفی (صفات) میں غلو سے کام لیا' یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کو کالعدم بنا دیا اور مقاتل نے اثبات (صفات) میں غلو کیا' یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کو اُس کی مخلوقات کے مشابہ قرار دے دیا۔ حافظ شمس الدین ذہبی نے ان کو ضعفاء میں شمار کر کے لکھا ہے کہ مقاتل بن سلیمان مفسر' تباہ حال ہیں' وکیع اور نسائی نے ان کو کذاب کہا ہے۔ حافظ ابن حجر نے ان کے احوال کا خلاصہ یوں نکالا ہے کہ علماء نے ان (مقاتل) کی تکذیب کی ہے اور ان کی روایات کو چھوڑ دیا ہے اور ان پر فرقۂ مجسمہ میں

سے ہونے کا الزام بھی ہے۔

اتنی شدید جرح وتنقید کے باوجود کتبِ تفسیر میں مقاتل بن سلیمان کے اقوال بڑی کثرت سے ذکر کیے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ اگرچہ روایتِ حدیث کے حوالے سے وہ قابل بھروسہ نہیں لیکن وہ وسیع المعلومات آدمی تھے۔ چونکہ انہوں نے اپنی زندگی کا بڑا مشغلہ علم تفسیر ہی کو بنایا تھا اور اس بارے میں مختلف طریقوں اور حوالوں سے معلومات جمع کی تھیں' اس لیے ان کی تفسیر میں بعض کام کی باتیں بھی نکل آتی ہیں۔ اس لیے یہ معلومات بھی مفسرین نے ذکر کر دی ہیں تاکہ محقّق علماء ان میں سے کوئی بات مفید یا صحیح پائیں تو قبول کر لیں' ورنہ پھر ردّ کر دیں۔ امام احمدؒ کا کہنا ہے کہ ان (مقاتل) کے پاس کچھ کتابیں تھیں جنہیں وہ دیکھتے رہتے تھے' مگر میرا خیال ہے کہ قرآن کا کچھ علم ان کے پاس تھا۔ ابراہیم نخعیؒ کا بیان ہے کہ مقاتل نے مختلف لوگوں کی تفسیریں جمع کر کے ان کے مطابق تفسیر کی ہے' مگر کسی سے ان تفسیروں کو براہِ راست نہیں سنا۔ عباس بن مصعب مروزیؒ بتاتے ہیں کہ انہیں تفسیر تو یاد تھی مگر سند یاد نہ تھی۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ نے مقاتل کی تفسیر دیکھی تو کہا کہ اس میں علم تو بڑا عجیب ہے' کاش! کہ اس کی (صحیح) اسناد بھی ہوتیں۔ ابن حبانؒ تحریر کرتے ہیں کہ وہ (مقاتل) یہود و نصاریٰ سے قرآن کا علم حاصل کرتے جو ان کی کتابوں کے موافق ہے۔ خلیلی کا قول ہے کہ وہ وسیع العلم تھے لیکن حُفّاظِ حدیث نے روایت میں ان کو ضعیف قرار دیا ہے۔ لہٰذا مقاتل بن سلیمان کے تفسیری اقوال پر روایتی نقطۂ نظر سے تو ہرگز بھروسہ نہیں کرنا چاہیے' البتہ لغت و ادب' تاریخ و قصص' کتب سابقہ کے حوالہ جات اور معلوماتِ عامہ کے لحاظ سے ان میں کام کی باتیں بھی مل جاتی ہیں' جن سے محقق اہلِ علم کچھ نہ کچھ فائدہ بھی اٹھا سکتے ہیں۔ اسی لیے عام مفسرین نے ان اقوال کو نقل کرنے میں کوئی خاص قباحت نہیں سمجھی۔ مقاتل بن سلیمان ۱۵۰ھ میں اس دارِ فانی سے رخصت ہوئے۔

(۴) ربیع بن انس: یہ ربیع بن انس البکری ہیں' اصلاً بصرہ کے باشندے ہیں' پھر خراسان چلے گئے تھے' اس لیے ان کو بصری بھی کہا جاتا ہے اور خراسانی بھی۔ ربیع نے حضرت انس رضی اللہ عنہ' ابوالعالیہ اور حسن بصریؒ وغیرہ سے روایات لی ہیں۔ ابوحاتم' العجلی اور امام نسائی نے ان کے لیے 'صَدوق' یا 'لیس بِہٖ بأس' کے الفاظ استعمال کیے ہیں جو ادنیٰ درجے کی توثیق ہے۔ البتہ

یحییٰ بن معین کا ربیع کے بارے میں قول ہے کہ وہ شیعہ تھے اور (تشیع میں) افراط سے کام لیتے تھے۔ ابن حبان نے اگرچہ ان کو ثقات میں شمار کیا ہے' مگر ساتھ ہی کہا ہے کہ ابوجعفر رازی نے ان کی جو روایات ذکر کی ہیں' لوگ ان سے احتراز کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کی روایات میں اضطراب بہت ہے۔ (اضطراب سے مراد ہے کہ راوی سند کی ترتیب یا متن کے الفاظ کی ترتیب بدل دیتا ہو یا اسے الفاظ کی ترتیب یاد ہی نہ رہتی ہو) حافظ ابن حجرؒ نے ان کے بارے میں یہ خلاصہ نکالا ہے کہ وہ سچ بولتے ہیں' مگر ایک تو ان کو روایات (کے ضمن) میں وہم بھی ہو جاتا ہے' دوسرے ان پر تشیع کا الزام ہے۔

(۵) عطیۃ العوفی: آپ عطیہ بن سعد بن جنادہ العوفی الجدلی ہیں اور کنیت ابوالحسن ہے۔ آپ تابعی اور کوفہ کے رہائشی ہیں۔ حضرت ابوسعید خدری' حضرت ابوہریرہ' حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر (رضی اللہ عنہم) سے روایات نقل کرتے تھے۔ امام نسائی' امام احمد' یحییٰ بن سعید القطان' ہشیم' ابوحاتم' ابن عدی' جوزجانی' ابن حبان' امام ابوداؤد اور ساجی رحمہم اللہ وغیرہ نے ان کی تضعیف کی ہے۔ صرف ابن سعدؒ نے اتنا لکھا ہے کہ وہ ٹھیک احادیث روایت کرتے ہیں اور بعض لوگ ان سے استدلال نہیں کرتے۔ ابوزرعہؒ نے عطیہ کو 'لیّن' اور یحییٰ بن معینؒ نے ان کو صالح کہا ہے' گویا دونوں نے ادنیٰ اور ہلکے درجے کی توثیق کی ہے۔ دراصل عطیۃ العوفی پر چار قسم کے اعتراضات ہیں۔ پہلا اعتراض تو یہ ہے کہ انہوں نے روایات کی سند میں مغالطہ انگیزی کا ارتکاب کیا ہے۔ امام احمدؒ اور ابن حبانؒ نے اس کی یہ تفصیل بتائی ہے کہ یہ کلبی کے پاس جا کر اس سے تفسیر کے بارے میں سوالات کیا کرتے تھے اور اس سے روایات اخذ کرتے' لیکن کلبی چونکہ ضعیف اور بدنام مشہور ہیں' اس لیے انہوں نے اس (کلبی) کی کنیت اپنی طرف سے ابوسعید رکھ لی تھی' اور عطیہ جو روایات کلبی سے سنتے' ان کو کلبی کا نام لینے کی بجائے ابوسعید کی کنیت سے روایت کر دیتے۔ چونکہ عطیہ العوفی نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے بھی بعض احادیث سنی تھیں' اس لیے ناواقف لوگ یہ سمجھتے کہ یہ روایت بھی حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہوگی' حالانکہ وہ روایت حقیقت میں کلبی سے اخذ کردہ ہوتی تھی (تہذیب التہذیب)۔ ان پر دوسرا یہ اعتراض ہے کہ وہ شیعہ ہیں۔ تیسرا یہ اعتراض ہے کہ روایات نقل کرنے میں غلطیاں کرتے ہیں اور چوتھا اعتراض عطیہ پر یہ ہے کہ وہ مدلّس ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ ان کے بارے میں لکھتے

ہیں: صَدوق یخطئ کثیراً' کان شیعیًا مدلّسًا (سچ بولنے والے مگر غلطیاں بہت کرتے ہیں' شیعہ اور مدلس تھے)۔ شمس الدین ذہبیؒ ان کا تذکرہ ضعفاء میں کرتے ہوئے رقمطراز ہیں: ''تابعی مشهور' مجمع علی ضعف'' (مشہور تابعی ہیں' ان کے ضعف پر اجماع ہے)۔ البتہ امام ترمذیؒ نے عطیۃ العوفی کی بعض روایات کو حسن قرار دیا ہے' لیکن امام ترمذیؒ کی اصطلاح میں حسن سے مراد ہر وہ حدیث ہوتی ہے۔ جس کی سند میں کوئی راوی متہم بالکذب نہ ہو اور وہ ایک سے زائد طرق سے مروی ہو۔ عطیہ کی روح ۱۱۱ھ میں اس قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

(۶) عبدالرحمٰن بن زید: آپ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم المدنی ہیں۔ ان کو اکثر و بیشتر محدّثین نے ضعیف قرار دیا ہے' صرف امام بن عدی کا قول ہے: ''ان سے حسن احادیث مروی ہیں' وہ ان راویوں میں سے ہیں جن کو لوگوں نے گوارا کیا ہے' اور بعض حضرات نے ان کی تصدیق کی ہے' ان کی احادیث لکھی جا سکتی ہیں''۔ باقی تمام علمائے جرح وتعدیل نے ان کی تضعیف کی ہے۔ امام بخاری کا کہنا ہے کہ علی بن المدینی نے ان کو بہت ضعیف کہا ہے۔ امام نسائی' امام احمد اور ابوزرعہ نے بھی عبدالرحمٰن بن زید کی تضعیف کی ہے۔ امام ابوداؤدؒ کا قول ہے کہ زید بن اسلم کے تمام بیٹے (روایت کے حوالے سے) ضعیف ہیں۔ ابوحاتم ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اپنی ذات میں صالح آدمی تھے مگر حدیث میں بہت کمزور۔ ابن حزیمہ رقم طراز ہیں:

لیس هو ممن یحتج اهل العلم بحدیثه لسوء حفظه' وهو رجل صناعته العبادة والتقشف

(وہ ان لوگوں میں سے نہیں کہ جن کی حدیث سے اہلِ علم استدلال کر سکیں' کیونکہ ان کا حافظہ کمزور تھا' اور ان کا اصل کام عبادت وزہد ہے۔)

عبدالرحمٰن کے بارے میں ابن حبان کا بیان ہے کہ وہ روایات کو غیر شعوری طور پر پلٹ دیتے تھے' یہاں تک کہ ان کی روایت میں ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ مرسل (حدیث) کو مرفوع بنا دیا اور موقوف کو مسند کر دیا' اس لیے وہ ترک کر دینے کے مستحق ہیں اور بقول امام طحاویؒ: حدیثه عند اهل العلم بالحدیث فی النهایة من الضعف (علمائے حدیث کی نظر میں ان کی احادیث انتہائی ضعیف ہیں)۔ اس کے علاوہ امام مالک' ابن معین' ابن سعدؒ' معن'

ساجی' جوزجانی' حاکم اور ابونعیمؒ سے بھی ان پر سخت جرح منقول ہے۔ تہذیب التہذیب کے مطابق ابن جوزیؒ نے لکھا ہے: اجمعوا علی ضعفه (ان کے ضعف پر اجماع ہے) اس لیے ابن حجر نے بھی عبدالرحمٰن بن زید کے بارے میں یہی فیصلہ کیا ہے کہ وہ ضعیف ہیں (التقریب التہذیب) آپ ۱۸۲ھ میں راہی ملک عدم ہوئے۔

(۷) محمد کلبی: یہ محمد بن السائب بن بشر بن عمرو بن عبدالحارث بن عبدالعزی الکلبی ہیں اور کنیت ابوالنظر ہے۔ یہ کوفہ کے باشندے اور بنوکلب کی طرف منسوب ہیں۔ علمائے حدیث ان کے ضعیف اور ناقابلِ اعتبار ہونے پر متفق ہیں۔ صرف ابن عدیؒ نے ان کے بارے میں اتنا لکھا ہے: ''وہ تفسیر میں مشہور ہیں اور کسی کی تفسیر' ان کی تفسیر سے زیادہ طویل نہیں ہے' اور ان سے بعض ثقہ لوگوں نے بھی حدیثیں لی ہیں' اور تفسیر میں انہیں گوارا کیا ہے' البتہ حدیث میں ان کی روایات منکر ہیں''۔ لیکن باقی تمام اہلِ علم نے کلبی پر شدید جرح کی ہے۔ ان پر سب سے سنگین الزام جھوٹی روایتیں بیان کرنے کا ہے۔ معتمر بن سلیمان اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ کوفہ میں دو کذّاب تھے اور ان میں سے ایک کلبی ہیں۔ تفسیر میں ان کی بیشتر روایات ابوصالح سے مروی ہیں' لیکن ابوجناب کلبی بیان کرتے ہیں کہ ابوصالح نے قسم کھا کر کہا کہ مَیں نے کلبی کو کوئی بات تفسیر کی نہیں سنائی۔ سفیان ثوریؒ کا کہنا ہے کہ کلبی نے ایک مرتبہ خود اعتراف کیا کہ مَیں نے ابوصالح سے ابن عباسؓ کی جو روایتیں بیان کی ہیں' وہ جھوٹ ہیں' تم انہیں آگے روایت نہ کرو۔ سفیان ثوریؒ سے بعض احادیث کلبی کی سند سے مروی ہیں' اس سے بعض لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ جب سفیان ثوری جیسا محدث کلبی سے روایت کرتا ہے تو وہ ثقہ ہی ہوں گے۔ لیکن اس کی حقیقت ابوحاتم بتاتے ہیں کہ سفیان ثوری کا مقصد ان سے روایت لینا نہیں تھا' بلکہ انہوں نے بعض اوقات اظہارِ تعجب کے لیے کلبی کی روایات مجلس میں سنائیں' اس پر بعض حاضرین نے ان روایات کو سفیان ثوریؒ سے نقل کر دیا۔ (تہذیب التہذیب)

حافظ ذہبیؒ نے خود سفیان ثوریؒ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ لوگوں سے کہا کہ کلبی سے بچو۔ حضرت قرۃ بن خالد کا قول ہے کہ لوگوں کا خیال عام طور سے یہ تھا کہ کلبی جھوٹ بولتے ہیں۔ ان پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ یہ انتہائی غالی شیعہ تھے۔ ابوجزء کہتے ہیں کہ مَیں نے اس (کلبی) کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ایک دفعہ حضرت جبریل علیہ السلام حضور پر وحی لے کر آئے تھے'

حضور ﷺ کسی کام سے اٹھ کر چلے گئے‘ حضرت علی ؓ وہاں بیٹھے تھے تو جبریلؑ نے وہ وحی حضرت علی ؓ پر نازل کر دی۔ ابو جزء کا یہ قول محدث یزید بن زریع کے سامنے نقل کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ مَیں نے کلبی سے یہ بات تو نہیں سنی‘ لیکن مَیں نے یہ خود دیکھا ہے کہ وہ سینہ پیٹ پیٹ کر کہہ رہے تھے کہ مَیں سبائی ہوں‘ مَیں سبائی ہوں۔ یہی قول حافظ ذہبی نے ہمام سے بھی نقل کیا ہے کہ مَیں نے اس (کلبی) کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ مَیں سبائی ہوں۔ ابن حبان کا کہنا ہے کہ کلبی سبائی تھا اور ان لوگوں میں سے تھا جو یہ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ کی وفات نہیں ہوئی‘ وہ دوبارہ دنیا میں آئیں گے اور اس کو ایسے وقت میں عدل و انصاف سے بھر دیں گے جب وہ ظلم و جور سے بھری ہوگی۔ یہ لوگ جب کوئی بادل دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ امیر المؤمنین (حضرت علیؓ) اس میں ہیں۔ (میزان الاعتدال)

مختصراً یہ کہ محمد کلبی قرونِ اولیٰ کے مفسّرین میں سے ضعیف ترین مفسّر ہیں۔ امام احمدؒ سے پوچھا گیا کہ کیا کلبی کی تفسیر کو دیکھنا جائز ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ حافظ ذہبیؒ ان کے تذکرے کے بعد لکھتے ہیں: لا یحل ذکرہ فی الکتب فکیف الاحتجاج بہ؟ (کتابوں میں ان کا ذکر ہی درست نہیں‘ تو ان سے استدلال کیونکر درست ہو سکتا ہے؟) کلبی نے ۱۴۶ھ میں وفات پائی۔

خلاصۂ کلام

ویسے تو کُتبِ تفسیر میں اور بھی بہت سے ضعیف رواۃ کے نام آتے ہیں‘ لیکن اس ضمن میں جن حضرات کا ذکر اوپر ہو چکا ہے‘ یہی وہ راوی ہیں جن کے حوالے تفاسیر میں انتہائی کثرت سے آئے ہیں۔ اس حوالے سے اگر یہ کہا جائے تو شاید مبالغہ نہیں ہوگا کہ بعد میں آنے والی تمام تفاسیر کا بنیادی ماخذ یہی حضرات ہیں اور اکثر و بیشتر کُتبِ تفاسیر انہی کی روایات اور اقوال کے گرد گھومتی ہیں۔ ان رواۃ کے احوال معلوم ہونے سے‘ ان شاء اللہ‘ ان تمام تفاسیر کے مطالعے میں بصیرت پیدا ہوگی جن میں تفسیر بالروایۃ کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے‘ جیسے تفسیر ابن جریر‘ تفسیر ابن کثیر وغیرہ‘ یا جن تفاسیر میں سند کے بغیر قدیم ائمہ تفسیر کے اقوال بیان ہوئے ہیں‘ مثلاً تفسیر روح المعانی اور تفسیر القرطبی وغیرہ۔

❁❁❁

- ہمارا دین "دینِ توحید" ہے اور "توحید" کی ضِد "شِرک" ہے۔
- شِرک سب سے بڑا گناہ ہے اور ناقابلِ درگزر ہے۔
- قرآن کی رو سے شرک "ظلمِ عظیم" ہے۔
- شِرک ہر دور میں نئی نئی صورتیں اختیار کرتا ہے۔
- مسلمان جہالت اور ناسمجھی کے سبب شِرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

شِرک کی حقیقت اور اس کی اقسام سے واقفیت‘ اور دورِ حاضر کے شِرک سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے مطالعہ کیجیے:

حقیقت و اَقسامِ شرک

بانیٔ تنظیم اسلامی

محترم **ڈاکٹر اِسرار اَحمد** رحمۃ اللہ علیہ

کے چھ فکر انگیز خطابات

❁ معیاری کمپیوٹر کمپوزنگ ❁ عمدہ طباعت ❁ 128 صفحات

قیمت: اشاعت عام: 80 روپے‘ اشاعت خاص: 160 روپے

شائع کردہ: **مکتبہ خُدّام القُرآن لاہور**

36۔ کے‘ ماڈل ٹاؤن لاہور۔ فون: 3-35869501

email: maktaba@tanzeem.org Website: www.tanzeem.org

Jan 2022
Vol.71

Regd. CPL No.115
No.1

Monthly Meesaq Lahore

بانیٔ تنظیم اسلامی کی تمام کتب سے ماخوذ
مختلف موضوعات پر منتخب اقتباسات کا گلدستہ

فرمودات
ڈاکٹر اسرار احمدؒ
مکتبہ خدام القرآن لاہور

قیمت:-/400
384 صفحات
امپورٹڈ بک پیپر
معیاری طباعت
دیدہ زیب ٹائٹل
مضبوط جلد

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور
K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)